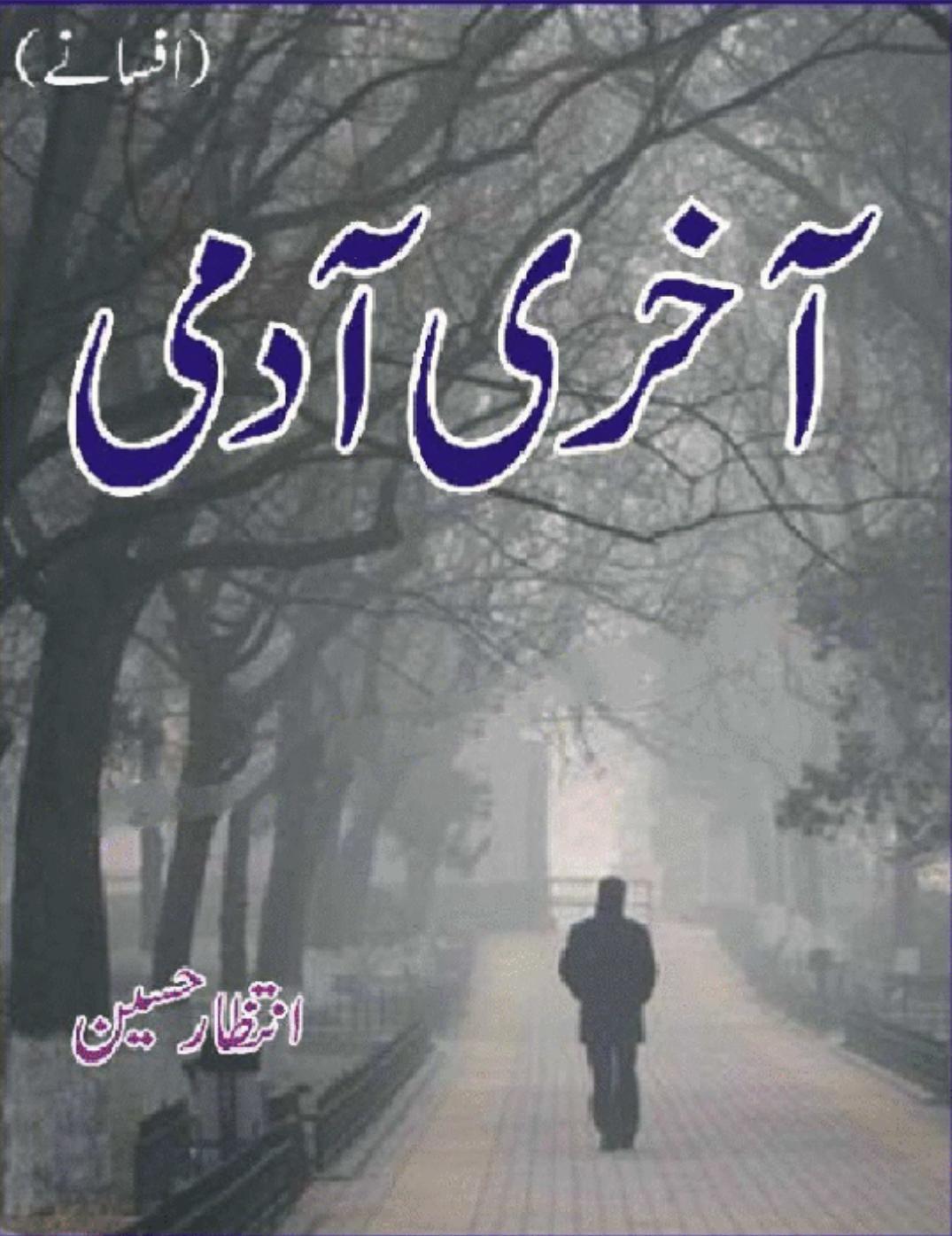


(افسانے)

آخری آدی

انتظار حسین



آخری آدمی

(افسانے)

انتظار حسین

اپنے کرداروں کے بارے میں

ہماری برادری کی ایک بی بی کراچی میں میری ہمیشہ صاحب سے ملیں اور شکایت کی کہ ”ہنونہارے ننانے تیرے بھئے کا کیا بکارا تھا جو وہ اس کے پچھے پڑ گیا ہے“

میری ہمیشہ اس پر بہت بگریں اور جواب دیا کہ ”بی بی میرا بھی کسی کے لینے میں نہ دینے میں وہ تو اپنی کتابوں میں پٹا پڑا رہوے ہے وہ کیوں تیرے ننانے کے پچھے پڑتا“

میری ہمیشہ کو یہ بات تھوڑی درج معلوم ہوئی کہ ان کا بھیانا تابے گناہ بھی نہیں ہے جتنا وہ سمجھ رہی تھیں دوسروں کے ناناوں کے ساتھ ساتھ کتنی اپنے خاندان کے اندر کے نانا کسی نہ کسی بھانے میرے افسانوں میں در آئے۔

یہاں زمانے کا ذکر جب میں نے ابھی ابھی افسانہ لکھنا شروع کیا تھا جو لوگ اچانک آنکھوں سے اچل ہو گئے تھے وہ مجھے بے طرح یاد آ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں میں اپنی بستی میں بھکلتا ہوا چھوڑ آیا تھا مگر پھر وہ لوگ بھی یاد آتے تھے منوں میں وہ بے پاؤں پڑے تھے۔ میں اپنی یادوں کے عمل سے اس سب کو اپنے نئے شہر میں بالائیا چاہتا تھا کہ وہ پھر اکٹھے ہوں اور میں ان کے واسطے سے اپنے آپ کو محبوں کر سکوں۔

جب میں یہ افسانے لکھ رہا تھا تو میرے ایک محترم دوست شیخ صلاح الدین نے بہت بیزار ہو کر کہا کہ تمہارے افسانوں میں عورت نظر نہیں آتی۔

”عورت؟ شیخ صاحب اتنی تو عورتیں ہیں میرے افسانوں میں، عورتیں نہیں، عورت۔ عورت کہاں ہے تیرے افسانوں میں؟“ اس اعتراض نے مجھے تھوڑا گزر بڑا یا۔ میں نے اپنی یادوں کو گردیدا۔ دھندا دھندا لاخیال آیا کہ اپنی برادری میں ایک دو عورتوں نے عورت بننے کی بہت تو کی تھی مگر یا تو وہ درمیان میں پچک گئیں یا اس برادری نے جہاں پچھاں اور بولڑھیاں بھی پرده کرتی تھیں ان

کے کچنوں پر پر وہ ڈال دیا یا پھر اس معاملہ میں اپنا مشاہدہ کمزور تھا۔ مگر خیر میں نے اپنے اس لفظ کو مسئلہ نہیں بنایا۔ بات یقینی کہ اس آن ڈھلی عروالے لوگ میرے لئے ایک واردات بن گئے تھے۔ ان کی ڈھلی عربیں اس تہذیب کی علمات بھی ہوئی تھیں جس نے مجھے ایک جذبہ بن کر آ لیا تھا۔ پھر جانے کیسے میں ان بچوں کی کہانیاں لکھنے لگا جن کے بیہاں بھنسی جذبوں جا گئے ہیں موتیا کے نئے نئے پودے پر کسی روز من اندھیرے اچانک کلی چکتی ہے۔

یہ افسانہ لکھنے لکھنے میں نے ایک ناول ”دن“ کے عنوان سے لکھا ہے پڑھ کر میرے کمی دوستوں کو شک ہوا کہ میں نے اپنی ذاتی زندگی کی تصویر جس طرح ان کے سامنے پیش کی تھی وہ شاید اس طرح نہیں تھی اور سعید محمود نے مجھے کریڈ اور تحسینہ کون تھی؟ ”تحمیہ تحسینہ ہے۔“ میں نے کہا

اس جواب سے اسے اطمینان نہیں ہوا۔ اس نے میرے گھر جا کر یہ سوال کر ڈالا اور میرے چھوٹے بھائیجے نے اپنے بڑے بھائی کی طرف دیکھا اور بڑے بھائی نے بہن کی طرف دیکھا اور پھر سب نے بیک آواز کہا کہ ہمارے ماں اور اولاد پشاں لکھتے رہے ہیں۔ تحسینہ وہی کوئی نہیں تھی۔

تب میں نے سعید سے کہا کہ اے میرے سادہ دل دوست تحسینہ کو تو خود میں نے ڈھونڈا اور نہ پایا۔ تو اسے کہاں سے پا لے گا۔ بات یہ ہے کہ ایک مشکل میر صاحب کو مہتاب میں نظر آئی تھی اور ایک صورت مجھے خواب میں دکھائی دی اور چاند میں نظر آئے والی ٹھیکیں زمین پر نظر نہیں آتیں اور خواب میں دکھائی دینے والی صورتیں عالم ہیداری میں دکھائی نہیں دیتیں اور چلتے چلتے کسی پر تحسینہ کا شک ہی ہوا تو تھوڑی دیر کے لئے پڑھلا کر تو قدمات پسند لڑکی ہے اس بیان سے میری مراد یہ ہے کہ کروار افسانے میں تجربہ اور مشاہدے ہی کے واسطے سے نہیں آتے۔ خوابوں کے راستے سے بھی ظہور کرتے ہیں۔ مگر ہر چند کہ تحسینہ کو گوشت و پوست میں کبھی نہیں دیکھا گردد مجھے قدمات پسند لڑکی سے زیادہ حقیقی اور سچی خالوق نظر آتی ہے اصل میں میں نے محبت کے تجربے کے حوالے سے افسانہ نہ لکھنے کا جو ذاتی عذر دوستوں سے کہا تھا اس کی قلمی ”دن“ لکھتے ہوئے خود ہی مجھ پر کھل گئی۔ کروار اور بڑکھا چال سے افسانہ میں آتے ہیں مشاہدے کے راستے آتے آتے کوئی کروار اٹھے رستے پر پڑیتا ہے اور پہلی توڑ کر آمد ہوتا ہے۔ مشاہدے کا راستہ سیدھا ہے اور آسان ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ہمارے باوآدم نے چند لکھیں اپنی جان کو لکھی تھیں اولاد نے باپ کی لکھیوں سے قیض اٹھایا مگر اس اولاد میں سے جس نے تعلیقی آدمی بننے کا دعویٰ کیا اس کے سر پر بوجھ ڈالا گیا کہ وہ اپنے جدا ہجہ کی لکھیوں کو امانت جانے اور ان کے دکھ بھرے تجربوں کو فرماؤش نہ ہونے دے سو افسانہ پسلیاں عزیز رکھ کر نہیں لکھا جا سکتا اور ہر افسانہ لگا کرو اپنی

مصیبت زیادہ بڑی مصیبت نظر آتی ہے۔ مجھے خواہ تکوہ یہ خیال ہو گیا ہے کہ میرے کرداروں کو میری پسلیوں سے زیادہ دشمنی ہے۔ وہ مشاہدے میں بھی آتے ہیں تو پھر روپوش ہو جاتے ہیں۔ پھر حدت بعد وہ پسلی توڑ کر اپنی صورت دکھاتے ہیں حاضر موجود لوگ مجھے بو کرتے ہیں مگر جب وہ اچھل ہو جاتے ہیں تو مجھے یاد آتے ہیں کتنا اچھا ہوتا کہ لوگ آنکھوں سے اچھل نہ ہوا کرتے اور انسانی رشتے جوں کے توں رہا کرتے اور مجھے افسانہ لکھنے کی مصیبت ناخافی پڑتی مگر فسوس ہے کہ انسانی رشتے ہر آن بدلتے ہیں اور بکھرتے ہیں لوگ مر جاتے ہیں یا سفر پر لکھ جاتے ہیں یا رونجھ جاتے ہیں پھر میں انہیں یاد کرتا ہوں اور انہیں خوابوں میں دیکھتا ہوں اور افسانے لکھتا ہوں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کی حرکت قلب بند ہو جاتی ہے اور وہ مر جاتے ہیں یا موڑ کے نیچے آ جاتے ہیں اور کچل جاتے ہیں۔ ان درماندوں میں ہوں جو کوئی زہر لی چیز کھایتے ہیں اور کھل کھل کر مرتے ہیں۔ حادثے مجھ پر اثر نہیں کرتے اور لوگ فوری طور پر مجھ سے کچھ نہیں کہتے، وقت لگنگوں میں گوٹا ہوتا ہوں اور موقعہ واردات پر واردات کے معنی میری سمجھ میں نہیں آتے۔ منظر اور صورتیں اور آوازیں خوٹگوار ہوں یا ان خوٹگوار مجھ پر ان کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ مجھے پوچھتا ہے کہ مجھے تو زہر دیا گیا ہے۔ پھر مجھے خیندا آ جاتی ہے اور پسلی میں درود شروع ہو جاتا ہے زہر میرے اندر دھیرے دھیرے اترتا ہے۔ جیسے تحسین اور شعیر کے اندر اتراتا ہے۔ مگر ناصرا فلی مجھے شرطیں کہتا ہے۔ صحیح کہتا ہے میرے کردار خوش و فرم لوگ نہ سبی مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ اوپنی آواز سے رو تے بھی نہیں۔ اوپنی آواز سے رو نے والے لوگوں سے مجھے ابتداء کی یو آتی ہے۔ اصل میں گریہ وزاری اور نالہ و فریاد کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔

اے ایساں غلام کے کام پا

تم نے یاں غلام کے کام پا
ناہ دل میں جگنے پائے تو پھر بے شک آ قتاب میں شگاف ڈال دے کیا فرق پڑتا ہے۔ تحسینہ اگر روتی تو کیا لے لیتی اور شعیر اگر اپنا اعلان کر دیتا تو کیا پالیتا۔ آخری مومتی والی لڑکی نے اچھا کیا کہ اپنے آنسوؤں کو امام باڑے کی موم تیوں کے آنسوؤں میں چھا دیا اور شھنڈی آگ والی عورت یعنی پر پتھر کھ کر کھڑی چارپائی پسونچاتی تو کیا کرتی اپنے آپ کو ظاہر مت کرو کہ اپنے آپ کو ظاہر کرنے میں خواری ہے رسوانی ہے۔

اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنے کا فیلم ان لوگوں کا اپنا فیصلہ ہے۔ میں نے ان میں سے کسی کوکوئی ایسا مشورہ نہیں دیا تھا شعیر کا رو یا اس

کا اپنا رویہ ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں میں ضمیر نہیں ہوں میں تو اپنے آپ کو ظاہر مت کرو کہ اپنے آپ کو ظاہر کرنے میں خواری ہے رسوائی ہے۔

اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنے کا فیصلہ ان کا اپنا فیصلہ ہے میں نے ان میں سے کسی کو کوئی ایسا مشورہ نہیں دیا تھا ضمیر کا رویہ اسکا اپنا رویہ ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں میں ضمیر نہیں ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں مگر میں اپنے آپ کو زندگی میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ افسانے میں نہیں آخر افسانے میں ظاہر ہونے سے تو زندگی میں ظاہر ہونے کی علاوی تو نہیں ہو سکتی۔ سو مجھے افسانے کا کردار بننے میں کے کوڑی کا فائدہ ہے۔

افسانے میں میرا مسئلہ ظاہر ہونا نہیں ہے روپیش ہوتا ہے پتغیروں اور لکھنے والوں کا ایک معاملہ سدا سے مشترک چلا آتا ہے پتغیروں کا اپنی امت سے اور لکھنے والوں کا اپنے قارئین سے رشتہ دوستی کا بھی ہوتا ہے اور شفیقی کا بھی وہ ان کے درمیان رہتا بھی چاہتے ہیں اور ان کی دشمن نظر وہ سے پچنا بھی چاہتے ہیں میرے قارئین میرے دشمن ہیں میں ان کی آنکھوں داتوں پر چڑھنا نہیں چاہتا۔ سوجب افسانہ لکھنے میشتا ہوں تو اپنی ذات کے شہر سے بھرت کرنے کی سوچتا ہوں۔ افسانہ لکھنا میرے لئے اپنی ذات سے بھرت کا عمل ہے مگر بھرت ہمیشہ سے جان جو کھوں کا کھیل چلا آتا ہے۔ حضرت زکریا درخت کے تنے میں جا کر چھپتے تھے۔ مگر ان کی گیزی کا سر باہر لکارا گیا۔ اس سے دشمنوں نے ان کا پیچا پایا اور اپنے درخت اور اپنے پتغیر و دنوں کو دو شیم کر دیا۔ بہت لکھنے والوں نے اس طرح اپنی تحریر میں چھپنے کی کوشش کی اور اپنے دشمن قارئین کے ہاتھوں پکڑے گئے مگر رسول اللہ ﷺ نے کمال خوش اسلوبی سے غار میں پناہی اور ان کے وہاں داخل ہوتے ہی گھری نے غار کے منہ پر جالا پور دیا اور جالے میں ایک کبوتری نے آ کر انہوں دیے لکھنے والے کو بھی اسی کمال کے ساتھ اپنی تحریر میں چھپنا چاہیے تب ہی اس کی بھرت کا میاب ہو سکتی ہے۔ اپنی بھرت کی کامیابی اور ناکامی کا مجھے شیک اندماز نہیں البتہ میں ایک بات جانتا ہوں کہ میں پتغیر نہیں ہوں۔ سو میرے قدموں سے کوئی غارہ درخت کی کوئی کھکھل متبرک اور مقدس نہیں بنتی میری ذات کے ساتھ کچھ جھوٹیں، کچھ نجاشیں کچھ خوف اور دوسے لگے ہوئے ہیں۔ میں اپنی جھوٹوں اور نجاشیوں اور وسوسوں کی پوٹ لئے غاروں اور درختوں میں چھپا پھرتا ہوں اب میرے سبز قدموں سے غاروں اور درختوں کی تقدیس مٹکوک ہے۔

مگر میں چھپا ہوا کہاں ہوں میں نے اتنی ہمار بھرت کی ہے کہ اب مجھے خود یاد نہیں کہ میں کہاں پناہ گیر ہوں اپنی ایک کہانی میں میں نے اس کمکی کی کہانی کمکی تھی جو اپنا گھر لیتے لیتے اپنا نام بھول گئی تھی۔ اس نے بھیں سے جا کر پوچھا کہ بھیں بھیں میرا نام کیا

ہے۔ بھینس نے جواب دیئے بغیر دم بلاؤ کر اسے اڑا دیا۔ پھر اس نے گھوڑے سے جا کر یہ سوال کیا گھوڑے نے بھی اپنی کوتیاں بلا کر اس اڑا دیا۔ وہ بہت مغلوقات کے پاس یہ سوال لے کر گئی اور کسی نے اس کا جواب نہ دیا آخروہ ایک بوڑھیا کے منہ پر جائیٹھی۔ بوڑھیا نے ہشت کمھی کہہ کر اسے اڑا دیا اور کمھی کو اس ڈلت کے طفیل اپنا نام معلوم ہوا۔ کیا بیج ہے کہ میں نے جو بعض خوبست مارے کردار سوچے ہیں وہ اسی چکر میں ہوں۔ وہ شخص جو اپنی پر چھا میں سے ڈراڑا پھرتا تھا، وہ شخص جس کا سارا بدن سوچوں میں بیندھا ہوا تھا وہ شخص جسے اپنی نالگیں بکرے کی نظر آئیں، وہ شخص جو ہزار ریاضت کے باو جو دزروں کتے کی زد سے ندیج کا وہ شخص جو شہزادے سے کمھی بن گیا، وہ شخص جو آخرا کار بندر بن کر رہا میں نے ان سب کے پاس جا جا کر اپنا نام پوچھا ہے اور باری باری ہر ایک پر لٹک ہوا ہے کہ یہ میں ہوں۔ لیکن شاید میں ڈلت کے اس آخری مقام تک نہیں پہنچا ہوں جہاں پہنچ کر میں اپنے آپ کو پا سکوں۔ ڈلت کی اس انتبا تک پہنچتا میری افسانہ نگاری کا منتبا ہے۔

دیے گئے ایک لٹک اور بے شاید میں اب سالم صورت میں کہیں بھی پناہ گیر نہیں اس لپنے چھپنے میں بکھر گیا ہوں مہینوں وال کا قاعدہ تھا کہ سوتھی کے آتے آتے روز ایک چھپلی پکڑتا اور وہ اسے بھونتے اور مل کر کھاتے مگر ایک بار مہینوں وال کے ہاتھ چھپلی نہیں آئی۔ اس نے اپنی ران سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا اور چھپلی کی کمی اس سے پوری کی۔ مگر میں نے تو بہت بار ایسا کیا ہے کہ کردار میں تھوڑی کمی پیشی ہوئی تو اپنے آپ سے تھوڑا حصہ لیا اور اسے شامل کر کے کردار پورا کر دیا۔ ایسی صورت میں مجھے آپ کہاں ڈھونڈیں گے اور کیسے پکڑیں گے۔ میرے افسانے تو میری کربلا ہیں میرے ٹکڑے ٹکڑے ہوچے ہیں اور پوری کربلا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ خود میرے لئے یہ مسئلہ ہے کہ میں اس دلخت لخت کو کیسے جمع کروں اور کیسے زندگی میں اپنے آپ کو ظاہر کروں اپنے تمیں بردنے کا لاؤں۔



آخری آدمی

الیاسف اس قریبے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سو گندمیں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مردی گی اور اس نے آدمی کی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اس قریبے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے لوگ پہلے جیران ہوئے پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برپا دیتے ہیں اور باغ خراب کرتے تھے۔ نابود ہو گئے۔ پراسٹھ نے جوانی میں سبت کے دن چھپلیوں کے شکار سے منج کیا کرتا تھا کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں لوگوں نے اس کا براما نا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن چھپلیوں کے شکار سے منج کیا اور تم نے سبت کے دن چھپلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیرے دن یوں ہوا کہ العین رکی اونٹی گجرام العین رکی جور و خوبیگاہ میں داخل ہوئی اور سہی ہوتی العین رکی جور و کے پاس اٹھے پاؤں آئی۔ پھر العین رکی جور و خواب گاہ تک گئی اور جیران وہر اس اس واپس آئی۔ پھر یہ خبر دوڑ دوڑ پھیل گئی اور دوڑ دوڑ سے لوگ العین رکی کھڑا ہے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ العین رکی خواب گاہ میں العین رکی بجائے ایک بڑا بندرا آرام کرتا تھا اور العین رکی نے چھپلے سبت کے دن سب سے زیادہ چھپلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرا کو خبر دی کہ اے عزیز العین رکی بندر بن گیا ہے۔ اس پر دوسرا ذور سے ہنسا۔ تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا اور وہ ہنستا ہی چلا گیا حتیٰ کہ مدد اس کا سرخ پر گیا اور دانت نکل آئے اور چہرے کے خدوخال کھنچنے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال جیران ہوا۔ من اس کا کھلا کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں جیزت سے پھیلتی چلی گئی اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب ان زیلوں کو دیکھ کر ڈر اور یوں بولا کہ اے زیلوں کے بینے چھپے کیا ہوا ہے کہ تیرا چھڑہ گیڑا گیا۔ ان زیلوں نے اس بات کا براما نا اور غصہ سے دانت کچکپا نے لگا۔ تب الیاب مزید ڈر اور چلا کر بولا کہ اے زیلوں کے بینے تیری ماں تیرے سوگ میں

بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اس پر ان زبولون کا من غصہ سے لال ہو گیا اور دانت تھنچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہوا اور ان زبولون کا چڑھنے سے اور الیاب کا چڑھنے سے خوف سے بگڑتا چلا گیا۔ ان زبولون غصہ سے آپ سے باہر ہوا اور الیاب خوف سے اپنے آپ میں سکلتا گیا اور وہ دونوں کر ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوت تھے۔ آپ میں گھٹ گئے۔ ان کے پھرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں غم ہوتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضاء بگڑتے پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں غم ہوتے چلے گئے اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ جھیلیں بن گئیں اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں علمند تھا اور سب سے آخر تک آدمی بنا رہا۔ تشویش سے کہا کہ اے لوگو! مقرہ ہمیں کچھ ہو گیا ہے آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں بست کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو بھراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا اور حلقة زن ہو کے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ بہاں سے مایوس پھر اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو! وہ شخص جو ہمیں بست کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اگر سوچ تو اس میں ہمارے لئے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سننا اور دل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انہیں آ لیا۔ وحشت سے صورتیں ان کی چیزیں ہونے لگیں اور خدو خال منع ہوتے چلے گئے اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور سکتے میں آ گیا۔ اس کے پیچے چلنے والے بندر بن گئے تھے۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ پھر اس نے دیکھیں باسیں نظر ڈالی اور ہر سمت بندر دیکھئے۔ تب وہ ڈر اور ان سے کٹا کر چلا اور بستی کے اس کنارے سے اس کنارے تک چلا گیا اور کسی کو آدمی نہ پایا۔ جاننا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی۔ سمندر کے کنارے اور پنج برجوں اور بڑے دروازوں والی حولیبوں کی بستی بازاروں سے کھوئے سے کھوا چلتا تھا۔ کثرتا بیکھتا تھا۔ پردم کے دم میں بازار ویران اور اوپر ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں اور اوپنے برجوں میں اور عالیشان چھتوں پر بندری بندر نظر آنے لگے اور الیاسف نے ہر اس سے چہار سمت نظر دوڑائی اور سوچا کہ کیا میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ ایسا ذرا کہ اس کا خون جتنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معیود کی سواند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ اپنے منع صورت ہم جنوں کو دیکھا اور کہا تھیں میں ان میں سے نہیں ہوں گے۔ وہ بندر بیس اور میں آدمی کی جون میں ہوں اور الیاسف نے اپنے ہم جنوں سے نفرت کی۔ اس نے ان کی لال بیبیوں کا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نظر سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اچانک ان

زہلوں کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ اے الیاسف نفرت مت کر کے نفرت سے آدمی کی کایا بد جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے بیک میں انہیں میں سے تھا اور اس نے وہ دن یاد کئے جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے امتنان نہ لگا اور اسے بنت الاختز کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در در کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیچے دن یاد آئے کہ وہ سرد کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹھوٹا جس کے لئے اس کا تھی چاہتا تھا اور اس نے دیکھا کہ لمبے بال اس کے رات کی بوندوں سے بیکھے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے پچھوں کے موافق ترپتی ہیں اور پہیت اس کا گندم کی ڈھیری کی مانند ہے کہ پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے اور الیاسف نے بنت الاختز کو یاد کیا اور ہرن کے پچھوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرد کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹھوٹا جس کے لئے اس کا تھی چاہتا تھا اور پکارا کہ اسے بنت الاختز تو کہاں ہے؟ اسے وہ کہ جس کے لئے میرا جی چاہتا ہے دیکھو موم کا بھاری مہینت گزر گیا اور پھولوں کی کیا ریاں ہری ڈھیری ہو گئیں اور قریباں اوپنی شاخوں پر پھپٹ پھپٹاتی ہیں تو کہاں ہے اے خضری نہیں۔ اے اوپنی چھٹ پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہر شیوں اور چٹانوں کی درازوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی ٹھم تو یخی اتر آ اور اور مجھ سے آن مل کتیرے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارا تا آنکہ اس کا جی بھر آیا اور وہ بنت الاختز کو یاد کر کے رویا۔

الیاسف بنت الاختز کو یاد کر کے رویا گرا چاہک اسے یقید رکی جو ریا ڈائی جو یقید رکو ہند رکی جوں میں دیکھ کر روئی تھی جی کہ اس کی ہڑکی بندہ گئی اور بیتے آنسوؤں میں اس کے جیل لش بگزتے چلے گئے اور ہڑکی آواز جوشی ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی جوں بدل گئی تھی اس کا الیاسف نے خیال کیا بنت الاختز جن میں سے تھی ان میں مل گئی اور بے بیک جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور الیاسف نے اپنے تیک کیا کہ الیاسف ان سے محبت مت کر مہادا تو ان میں سے ہو جائے اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنوں کو ناجنس جان کر ان سے بے اعلق ہو گیا اور الیاسف نے ہرن کے پچھوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول بیالے کے فرماوش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنوں کی لاں بھیجا کا صورتوں اور کھڑکی و مکوں کیچھ کر چسا اور الیاسف کو یقید رکی جو رو

یاد آئی کہ وہ اس قرینے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاز کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں اور ایجدر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کر میں انگور کے خشے توڑوں گا اور انگور کے خوشوں والی ترپ کر ساحل کی طرف نکل گئی۔ ایجدر اس کے پیچے پیچے گیا اور پھل توڑا اور تاز کے درخت کو پینے گھر لے آیا اور اب وہ ایک اوپنے ٹکرے پر ایجدر کی جو میں ہیں ہیں کر کھاتی تھی۔ ایجدر جھر جھری لے کھرا ہو جاتا اور وہ دم کھروی کر کے اپنے میلے لجئے پتوں پر اٹھ پیٹھی اور ایجدر کے اگلے ہی اس کے بدرنگ بالوں والی پشت پنک جاتے۔ الیاسف یہ دیکھ کر بہسا اورہستا ہی چلا گیا اور اس کے ہنسنے کی آوازاتی اونچی ہوئی کہ اسے ساری بستی گنجی معلوم ہوئی اور وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر جیران ہوا اگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنسنے ہنسنے بندہ بن گیا تھا اور الیاسف نے اپنے ہنسنے کیا۔ اے الیاسف تو ان پر مت نفس مبارا توہنی کی جس بن جائے اور الیاسف نے ہنسنی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے ہنسنی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے غصہ اور ہمدردی سے رونے اور ہنسنے سے ہر گفتگی سے گزر گیا اور ہم جنوں کو ناہنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اچکنا، ذات ہیں پھیں کر کلکاریاں کرتا، کچے کچے پھلوں پر لڑتا اور ایک دوسرے کو لہلہبھان کر دینا یہ سب کچھ اسے آگئے بھی ہم جنوں پر رلاتا تھا کبھی ہستا تھا، کبھی غصہ دلاتا تھا کہ وہ ان پر ذات پینے لگتا اور انہیں حقارت سے دیکھتا اور یوں ہوا کہ انہیں لڑتے دیکھ کر اس نے خشک کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا پھر خود ہی اپنی آواز پر جیران ہوا اور کسی بندرنے اسے بے تعاقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جٹ گیا اور الیاسف کے ہنسنے لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب وہ اس کے ہم جنوں کے درمیان رشتہ ہیں رہے تھے اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنوں پر اپنے آپ پر اور لفظ پر افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے کہ مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا اور سوچ تو آج بڑے افسوس کا دن ہے کہ آج لفظ مر گیا ہے اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوح کیا اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے غصہ اور ہمدردی سے ہنسنے اور رونے سے درگزرا اور الیاسف نے اپنے ہم جنوں کو ناہنس جان کر ان سے کنارہ کر لیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لے لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر ہو کر جزیرے کی مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق، گھرے پانیوں کے درمیان خلکی کا نحشا سانشان اور جزیرے سے نے کہا کہ گھرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف کہ اپنے ہنسنے آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا۔ گھرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنالیا کہ محبت اور نفرت، غصہ اور ہمدردی غم اور خوشی اس پر یافتارنہ کریں کہ جذبہ کی کوئی روائے بہا کرنے لے جائے اور الیاسف اپنے جذبات

سے خوف کرنے لگا۔ پھر جب وہ پشت تیار کر کچکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے میئنے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا کہ اے معبدو کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں۔ تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی۔ اور اسے مگان ہونے لگا کہ وہ پتھری پھیل کر باہر ہے پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وہ سوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھلتا جا رہا ہے اور بال بدر گا اور سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ تب اسے اپنے بدن سے خوف آیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوف سے وہ اپنے اندر سستے گا اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی نانگیں اور بازوں مختصر اور سرچھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ تب اسے مزید خوف ہوا اور اعضاء اس کے خوف سے مزید سکلنے لگے اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل محدود ہو جاؤں گا۔

الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سست کروہ بذریں گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ اندر کے خوف پر اسی طور پر غائب پاؤں گا جس طور میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پالیا اور اس کے میئے ہوئے اعضاء کھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی انگلیاں بُی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے اور اس کی ہتھیلیاں اور ٹکوے چھپے لجیئے ہو گئے اور اس کے جوڑ کھلنے لگے اور الیاسف کو مگان ہوا کہ اس کے سارے اعضاء بکھر جائیں گے تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مخیال کر کر باندھیں اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگے۔

الیاسف نے اپنے بدھیت اعضاء کی تاب نہ لکرا آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضاء کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا، کیا میں نہیں جا رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈھینے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھوئی اور پچھے سے اپنے اعضاء پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے اعضاء تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اٹھیمان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں گمراں کے بعد آپ ہی آپ اسے پھر وہ سو سو ہوا کہ جیسے اس کے اعضاء بگزتے اور بدلتے جا رہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا وھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندر جیرے کو نیکیں میں دھستا جا رہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبد میرے باہر بھی دوزخ ہے، میرے اندر بھی دوزخ ہے۔ اندر جیرے کو نیکیں میں دھنتے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صوتوں نے اس کا تعاقب کیا اور گزری یادیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو سبت کے دن ہم جنسوں کا مچھلیوں کا ٹھکار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں مچھلیوں سے خالی ہونے لگا اور ان کی ہوں

برہتی گئی اور انہوں نے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔ جب اس شخص نے جوانیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتا تھا کہ رب کی سونگد جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کو مچھلیوں کا مامن نہیں رکھا۔ سمندر تمہارے دست ہوں سے پناہ مانگتا ہے اور سبت کے دن مچھلیوں پر قلم کرنے سے باز رہو کر مبادا تم اپنی جانوں پر قلم کرنے والے قرار پاؤ اور الیاف سے کہا کہ مجبود کی سونگد میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا۔ اور الیاف نے کہ عقل کا پاتا تھا سمندر سے فاصلہ پر ایک گڑھ کھووا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے طالیا اور سبت کے دن مچھلیاں سطح آپ پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گزرے میں نکل گئیں اور سبت کے دوسرا دن الیاف اس گزرے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر یوں بولا کر تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اور اللہ اس سے مکر کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ مکر کرنے والا ہے اور الیاف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وہ سکیا کہ کیا وہ مکر میں گھر گیا ہے۔ اس گھر میں اپنی پوری ہستی ایک مکر نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گزر گزا یا کہ پیدا کرنے والے تو نے مجھے ایسا پیدا کیا جیسا پیدا کرنے کا حق ہے تو نے مجھے بہترین کینڈے پر قلق کیا اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اسے پیدا کرنے والے کیا تواب مجھ سے مکر کرے گا اور مجھے ذلیل بندر کے اسلوب پر ڈھالے گا اور الیاف اپنے حال پر رہو یا۔ اس کے بنائے ہوئے پشتی میں دراز پڑ گئی تھی اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا۔

الیاف اپنے حال پر رہو یا اور بندروں سے بھری ہستی سے من موز کر جگل کی سوت کلک گیا اب ہستی اسے جگل سے زیادہ دشمن بھری نظر آتی تھی اور دیواروں اور چتوں والا گھر اس کے لئے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹہنیوں میں چپ کر برسر کی۔

جب صحیح کوہ جا گا تو اس کا سارا بدن دکھتا تھا اور بڑھ کی بڑی درد کرتی تھی۔ اس نے اپنے گزارے اعضاء پر نظر کی کہ اس وقت کچھ زیادہ گزارے گزارے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کیا میں میں ہوں اور اس آنے سے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تین سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہئے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بے شک آدم اپنے تین ادھورا ہے کہ آدمی آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جو جن میں سے ہے اور ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی اور پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھے ہن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاف کو ہرجن کے ترپے پھوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول بیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈ چلا آ رہا تھا اور الیاف نے درد سے صدا کی اے بنت الاخضر اے وہ جس کے لئے میرا جی پا جاتا ہے تجھے میں اوپنی چھت پر بچھے ہوئے پھر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی

شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپت دوڑتی دودھیا گھوڑوں کی قسم ہے تجھے کوتربیوں کی جب وہ بلندیوں میں پرواز کریں۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہے تجھے رات کے اندر ہرے کی جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندر ہرے کی اور نیند کی اور پکلوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں تو مجھے آنمل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا ہے اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گلٹہ ہو گئے جیسے زنجیر الجھنگی ہو جیسے لفظ مٹ رہے ہوں جیسے اس کی آواز بدلتی چارہ ہو اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر فور کیا اور ان زبولوں اور الیاب کو یاد کیا کہ کیوں کران کی آوازیں گلٹتی چلی گئی تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبد کیا میں بدلتی گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ زلا خیال سوچا کہ اے کاش کوئی اسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعہ وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا گریب خیال اسے بہت انہوں نظر آیا اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبد میں کیسے جانوں کیں نہیں بدلا ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود اسی اس خیال سے خائف ہو گیا اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اوپر گھروں سے خفغان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اوپر چلتے درخت رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خیال سے خائف چلتے چلتے جنگل میں دو رنگل کیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا شہر ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا، جی خشد کیا۔ اسی اشاء میں وہ موئی ایسے پانی کو سکھتے سکتے چونکا یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں جی خشد کا۔ اسی اشاء میں وہ موئی ایسے پانی کو سکھتے سکھنکا یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیز نکل گئی اور الیاسف کی چیز نے آیا اور وہ بھاگ کھرا ہوا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیز نے آیا تھا اور بے تشاہیجا گا چلا جاتا تھا وہ یوں بھاگا جاتا تھا جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تموے سے اس کے دکھنے لگے اور چھپے ہونے لگے اور کہ اس کی درد کرنے لگی۔ پر وہ بھاگتا رہا اور کہ کار درد بڑھتا چلا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی پٹی دوہری ہوا چاہتی ہے اور وہ دفعتا جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر نکال دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر نکال دیں اور بہت الاخضر کو سوچتا ہوا چاروں ہاتھ بیرون کے بل تیر کے موافق چلا۔



زروکتا

ایک چیز اور مزدی کا بچہ اسکی اس کے منہ سے کل پڑی۔ اس نے اسے دیکھا اور پاؤں کے بینے ڈال کر ورندنے لگا۔ مگر وہ جتنا روندتا تھا اتنا وہ بچہ بڑا ہوتا تھا۔ جب آپ یہ واقعہ فرمائچے تو میں نے سوال کیا۔

”یا شیخ اور مزدی کے بچہ کی رمز کیا ہے اور اس کے روندے جانے سے بڑے ہونے میں کیا بھیگی ہے؟“ تب شیخ عثمان کو ترے ارشاد فرمایا کہ اور مزدی کا بچہ تم افس امارہ ہے تیر انفس امارہ جتنا روندے جائے گا مونا ہو گا میں نے عرض کیا۔ شیخ اجازت ہے؟ فرمایا اجازت ملی اور پھر وہ اڑ کر ملی کے پیٹ پر جایئی۔ میں نے وضو کیا اور قلمدان اور کاغذ لے کر بیٹھا۔ اے ناظرین یہ ذکر میں باعیں ہاتھ سے قلبند کرتا ہوں کہ میرا دیاں ہاتھ دشمن سے مل گیا اور وہ لکھنا چاہا جس سے میں پناہ مانگتا ہوں اور شیخ ہاتھ سے پناہ مانگتے تھے اور اسے کہ آدمی کا فرقن و مدگار ہے، آدمی کا دشمن کہتے تھے۔ میں نے ایک روز یہ بیان سن کر عرض کیا۔

”یا شیخ تفسیر کی جائے۔ تب آپ نے شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا جو درج ذیل کرتا ہو۔“ شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں تیراقا تھا۔ ان کی زوج سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے ہوکایت کی۔ تب شیخ ابوسعید باہر لٹکا اور سوال کیا پر جو انہوں نے پایا وہ لے کر اٹھتے تھے کہ کتوval والوں نے انہیں جیب تراشی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور مزدی کے طور پر ایک ہاتھ قلم کر دیا۔ آپ وہ ترشا ہوا ہاتھ اٹھا کر گھر لے آئے۔ اسے سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے کہ اے ہاتھ تو نے طبع کی اور تو نے سوا کیا۔ سوتونے اپنا انجام دیکھا۔

”یہ قصہ سن کر میں عرض پرداز ہوا۔

یا شیخ اجازت ہے؟“

اس آپ پر خاموش ہوئے پھر فرمایا۔

اے ابو قاسم خضری لفظ کلمہ ہیں اور لکھنا عبادت ہے پس وضو کر کے دوز انو بیٹھ اور جیسا نہ سایا رقم کر۔ پھر آپ نے کلام پاک کی

آیت تلاوت کی۔

پس افسوس ہے ان کے لئے بوجا اس کے جوانہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لئے بوجا اس کے جو کچھ وہ
اس سے کماتے ہیں اور یہ آیت پڑھ کر آپ ملوں ہوئے میں نے سوال کیا۔

یا شیخ آیت آپ نے کیوں پڑھی؟ اور پڑھ کر ملوں کس باعث ہوئے؟ اس پر آپ نے آہ سرد بھری اور احمد جبڑی کا قصہ بنایا اور
من عن نقل کرتا ہوں۔ احمد جبڑی اپنے وقت کے بزرگ شاعر تھے مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ شہر میں شاعر بہت ہو گئے۔ امیاز ناقص وہ
کامل مٹ گیا اور ہرشا عرخا قافی اور انوری بننے لگا۔ قصیدہ لکھنے لگا۔ احمد جبڑی نے یہ حال دیکھ شعر گوئی ترک کی اور شراب پیتی شروع
کر دی۔ ایک گدھا خریدا کہ شراب کے گھرے اس پر لا دکر بازار جاتے تھے اور انہیں فروخت کرتے تھے لوگوں نے بہت لکھیاں
انھائیں کہ احمد جبڑا ہو، کلام پا کیزہ سے گزر کر شراب کا سودا گر ہوا۔ انہوں نے لوگوں کے کہنے پر مطلق کان نہ دھرا اور اپنے مشغل سے
لگ رہے۔ مگر ایک روز ایسا ہوا کہ گدھا ایک موڑ پر آ کر اڑا گیا۔ انہوں نے اسے چاک کر سید کیا تو اس گدھے نے انہیں مزکر دیکھا اور
ایک شعر پڑھا جس میں تجھیں لفظی استعمال ہوئی تھی اور مضمون یہ تھا کہ میں دورا ہے پر کھڑا ہوں۔ احمد کہتا ہے چل احمد کہتا ہے ملت
پل احمد جبڑی نے یہ سن کر اپنا گزیبان پھاڑا اور آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانے کا براہو کو گدھے کام کرنے لگے اور احمد جبڑی کی زبان کو
تالا لگ گیا۔ پھر انہوں نے گدھے کو آزاد کر کے شہر کی ستہ کادیا اور خود پہاڑوں میں نکل گئے۔ وہاں عالم دیواری میں درختوں کو
خطاب کر کے شعر کہتے تھے اور ناخن سے پتھروں پر کندہ کرتے تھے۔

یہ واقعہ سن کر شیخ خاموش ہو گئے اور درستک سر نیوڑے بائے پیٹھے رہے پھر میں نے عرض کیا:

”یا شیخ آیا درخت کلام سماعت کرتے ہیں۔ درآ نحا لیکد وہ بے جان ہیں۔ آپ نے سراخایا کر مجھے دیکھا۔

پھر فرمایا:

”زبان کلام کے بغیر نہیں رہتی۔ کلام سماع کے بغیر نہیں رہتا۔ کلام کا سامع آدمی پر آدمی کی ساعت جاتی رہے تو جو سامع سے
حروم ہیں انہیں سامع دل جاتا ہے کہ کلام سماع کے بغیر نہیں رہتا۔ پھر شیخ نے سید علی الجبڑی کا قصہ بیان فرمایا ملاحظہ ہو،“
سید علی الجبڑی اپنے زمانہ کے نامی گرامی شعلہ نفس خطیب تھے۔ پر ایک زمانہ ایسا آیا کہ انہوں نے خطاب کرنا ایک سر ترک
کر دیا اور زبان کو تالا دے لیا تب لوگوں میں بے چینی ہوئی۔ بے چینی بڑھی تو لوگ ان کی خدمت میں عرض پر دواز ہوئے کہ خدا را
خطاب فرمائیے۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھا ہمارا منبر قبرستان میں رکھا جائے۔ اس نرالی بدایت پر لوگ متوجہ ہوئے۔ خیر منبر قبرستان

میں رکھ دیا گیا۔ وہ قبرستان میں گئے اور منبر پر چڑھ کر ایک بلخ خطبہ دیا۔ اس کا عجوب اثر ہوا کہ قبروں سے درد کی صدا باندھ ہوئی تب سید علی الجرازی نے آپادی کی طرف رخ کر کے گلو گیر آواز میں کہا۔ اے شہرِ حق پر خدا کی رحمت ہوتی رہے جیتنے لوگ بہرے ہو گئے اور تیرے مردوں کو ساعت مل گئی۔ یہ فرمایا کہ وہ اس قدر روانے کہ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی اور اس کے بعد انہوں نے بستی سے کشناہ کیا اور قبرستان میں رہنے لگے جہاں وہ مردوں کو خطبہ دیا کرتے تھے۔

یہ قصہ سن کر میں نے استفسار کیا یا شیخ زندوں کی ساعت کب ختم ہوتی ہے اور مردوں کو کب کان ملتے ہیں؟ اس پر آپ نے غصہ سانس بھرا اور فرمایا۔

یہ اسرار الٰہی ہیں بندوں کو راز فاش کرنے کا اذن نہیں۔ پھر وہ پھر پھر اکر اڑے اور اعلیٰ کے درخت پر جا ہیٹھے۔ جانا چاہیے کہ شیخ عثمان کبوتر پر بندوں کی اڑا کرتے تھے اور اس گھر میں ایک اعلیٰ کا پیڑ تھا کہ جائزے گری برسات شیخ اسی کے سامنے میں محل ذکر کرتے چھت کے نیچے بیٹھنے سے حررتا۔ فرمایا کرتے تھے ایک چھت کے نیچے دم گھٹا جاتا ہے دوسرویں چھت برداشت کرنے کے لئے کہاں سے تاب لا سیں؟ یہ سن کر سید رضی پر وجد طاری ہوا اور اس نے اپنا گھر منہدم کر دیا اور ناثر پھن کر اعلیٰ کے نیچے آپڑا۔ سید رضی ابو مسلم بخدادی شیخ حمزہ ابو جعفر شیرازی حبیب بن میکی ترمذی اور یہ بندہ حقیقت شیخ کے مریدان فتحیر تھے۔ میرے سواباتی پانچوں مردوں ان باصفا تھے اور فقرتوں گلندری ان کا مسلک تھا۔ شیخ حمزہ تجوید کی زندگی بس کرتے تھے اور بے چھت کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ شیخ کی تعلیم سے متاثر تھے اور کہتے تھے کہ چھت کے نیچے رہنا شرک ہے۔ چھت ایک ہے کہ وحدہ لاثر یک نے پائی ہے۔ بندوں کو زیب نہیں کہ چھت کے مقابل چھت پائیں۔ ابو مسلم بخدادی صاحب مرتبہ ہاپ کا بینا تھا۔ پھر گھر چھوڑ کر ہاپ سے ترک تعلق کر کے یہاں آبیٹا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مرتبہ حقیقت کا حجاب ہے ابو جعفر شیرازی نے ایک روز ذکر میں اپنا الباس تار تار کر دیا اور چنانی کونزرا آتش کر دیا۔ اس نے کہا کہ چنانی مٹی اور مٹی کے درمیان فاصلہ ہے اور لباس مٹی کو مٹی پر فوقیت دیتا ہے اور اس روز سے وہ نگد دھونگ خاک پر بیسرا کرتا تھا اور ہمارے شیخ کے خاک ان کی مند اور اینٹ ان کا نکل تھی اعلیٰ کے تنے کے سہارے بیٹھتے تھے اور اس عالمِ علی سے بلند ہو گئے تھے۔ ذکر کرتے رہے اڑتے، کبھی دیوار پر کبھی اعلیٰ پر جا ہیٹھے، کبھی اونچا اڑ جاتے اور فھاٹیں کھوجاتے میں نے ایک روز استفسار کیا:

یا شیخ قوت پر وازا آپ کو کیسے حاصل ہوئی فرمایا
عثمان نے طبع دنیا سے منہ موز لیا اور پتی سے اوپر اٹھ گیا۔ عرض کیا یا شیخ طبع دنیا کیا ہے۔

فرمایا طبع دنیا تیر انفس بے عرض کیا انفس کیا ہے؟ اس پر آپ نے یہ قصہ سنایا شیخ ابوالحیاں اشتفانی ایک روز گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک زرد کتا ان کے بستر میں سورہ ہے انہوں نے قیاس کیا کہ شاید محلہ کا کوئی کتا اور گھس آیا ہے۔ انہوں نے اسے نکلنے کا ارادہ کیا مگر وہ ان کے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔

میں یہ سن کر عرض پر دواز ہوا۔

یا شیخ زرد کتا کیا ہے؟ فرمایا:

زرد کتا تیر انفس ہے۔ میں نے پوچھا یا شیخ انفس کیا کیا ہے؟ فرمایا
انفس طبع دنیا ہے۔ میں نے سوال کیا۔ یا شیخ طبع دنیا کیا ہے؟ فرمایا
طبع دنیا پتی ہے۔ میں نے استفسار کیا یا شیخ پتی کیا ہے۔ فرمایا
پتی علم کا نقدان ہے۔ میں مجھی ہوا یا شیخ علم کا نقدان کیا ہے؟ فرمایا
دانشمندوں کی بہتان میں نے کہا یا شیخ تغیر کی جائے۔ آپ نے تغیر بصورت حکایت فرمائی کہ لفظ کرتا ہوں۔

پرانے زمانے میں ایک بادشاہ بہت سی میہور۔ ایک روز اس کے دربار میں ایک شخص کو دانشمند جانا جاتا تھا، حاضر ہو کر عرض پر دواز ہوا کہ جہاں پناہ دانشمندوں کی بھی قدر چاہیے۔ بادشاہ نے اسے ظلعت اور ساختہ اشرفتیاں دے کر بعد عزت رخصت کیا۔ اس خبر نے اشتہار پایا۔ ایک دوسرے شخص نے کہ وہ بھی اپنے آپ کو دانشمند جانا تھا اور بار کارخ کیا اور با مراد پھر تیر شخص کو اپنے آپ کو اہل داش کے زمرہ میں شمار کرتا تھا۔ دربار کی طرف چلا اور ظلعت لے کر واپس آیا۔ پھر تو ایک تاتا بندھ گیا جو اپنے آپ کو دانشمند گردانے تھے جو حق درجوب دربار میں ٹکنچتے تھے اور انعام لے کر واپس آتے تھے۔

اس بادشاہ کا وزیر بہت عاقل تھا۔ دانشمندوں کی یہ دلیل بھی دیکھ کر اس نے ایک روز سر دربار میں دانشمند اس اس بھرا۔ بادشاہ نے اس پر نظر کی اور پوچھا کر تو نے دانشمند اس اس کس باعث بھرا؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔
جہاں پناہ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

فرمایا امان ملی تو تب اس نے عرض کیا خداوند نعمت تیری سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔

بادشاہ نے کہا اکمال تجھ ہے تو روزانہ دانشمندوں کو بھاں آتے اور انعام پاٹے دیکھتا ہے اور پھر بھی ایسا کہتا ہے۔
عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ اے آقاۓ ولی نعمت گدھوں اور دانشمندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں

وہاں کوئی گدھائیں ہوتا اور جہاں سب داشمند ہیں جائیں وہاں کوئی داشمند نہیں رہتا۔

یہ حکایت سننے کے بعد میں نے سوال کیا ایسا کب ہوتا ہے کہ سب داشمند ہیں جائیں اور کوئی داشمند نہ رہے؟ فرمایا جب عالم اپنا علم چھپائے سوال کیا یا شیخ عالم اپنا علم کب چھپاتا ہے؟ فرمایا جب جاہل عالم اور عالم جاہل قرار پائیں۔ سوال کیا کہ جاہل عالم کب قرار پاتے ہیں جواب میں آپ نے ایک حکایت بیان فرمائی جو اس طرح ہے۔

ایک نامور عالم کو تغلق دستی نے بہت سایا تو اس نے اپنے شہر سے دوسرے شہر بھرت کی۔ اس دوسرے شہر میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ انہوں نے اکابرین شہر کو خبر دی کہ قلاں دن، قلاں گھری ایک عالم اس شہر میں وارد ہو گا۔ اس کی تواضع کرنا اور خود سفر پر روانہ ہو گئے۔ اکابرین شہر مقررہ وقت پر بندراگاہ پہنچے۔ اسی وقت ایک جہاز آ کر کا۔ اس جہاز میں وہی عالم سفر کر رہا تھا مگر ایک موچی بھی اس کا سفر بھر بن گیا تھا۔ وہ موچی حرثوں اور کامل مزاج تھا۔ اس نے اس عالم کو سیدھا سادا دیکھ کر اپنا سامان ان پر لاد دیا اور چھڑی چھاٹ ہو گیا۔ جب جہاز سے دونوں اترے تو ایک ناٹ کے کرتے میں ملبوس کلش سازی کے سامان سے لدا پہندا تھا۔ اس پر کسی نے توجہ نہ دی اور دوسرے کو عزت و احترام سے اتارا اور ہمراہ لے گئے۔

وہ بزرگ جب سفر سے واپس آئے تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شخص جس کے چہرے پر علم و دانش کا نور عیاں ہے جو تیاں گا نظر ہاہے آگے گئے تو دیکھا کہ اکابرین و عالمدین کی ایک مجلس آرastہ ہے اور ایک بے بصیرت مسائل بیان کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بزرگ سر سے پاؤں تک کانپ گئے اور بولے۔

اے شہری ابراہ ہوتونے عالموں کو موچی اور موجیوں کو عالم ہنادیا۔ پھر خود کلش سازی کا سامان خریدا اور اس عالم سے قریب ایک کوچے میں جو تیاں گا نٹھنے بیٹھے گئے۔ یہ حکایت میں نے سنی اور سوال کیا یا شیخ عالم کی پیچان کیا ہے؟ فرمایا جس میں طبع نہ ہو۔

عرض کیا۔ ملک دنیا کا کب پیدا ہوتی ہے۔

فرمایا جب علم گھٹ جائے۔

عرض کیا علم کب گھٹتا ہے۔

فرمایا جب درویش سوال کرے شاعر غرض رکھے دیوانہ ہو شمد ہو جائے عالم تاجر ہن جائے۔ داشمند منافع کمائے۔ عین اس وقت ایک شخص جن میں یہ شعر پڑھتا ہوا گزرا۔

آپ نے اسے پکار کر کہا۔

ایے فلاں یہ شعر پھر پڑھ۔ اس نے وہ شعر پھر پڑھا۔ پھر آپ پر مراتبے کا عالم طاری ہو گیا اور جب آپ نے سراخایا تو یہ حکایت بیان فرمائی۔

ایک شہر میں ایک منجم تھا۔ اسی حادثت کی دھوم تھی۔ اس شہر میں ایک شاعر ایک عالم اور ایک دلنشدہ رہتا تھا۔ درویش پر ایک ایسا وقت آیا کہ اس پر تین دن فاقہ میں گزر گئے۔ جب وہ منجم کے پاس جا کر سوائی ہوا اور منجم نے اس کا دامن بھردیا۔ عالم کی بیوی نے درویش کو خوشحال دیکھا تو شوہر کو طعنے دینے شروع کئے کہ تمہارے علم کی کیا قیمت ہے؟ تم سے تو وہ درویش اچھا ہے کہ منجم اس کا دامن دولت سے بھردیا ہے۔ تب عالم نے منجم سے سوال کیا اور منجم نے اسے بھی بہت انعام و کرام دیا۔ دلنشدہ ان دونوں بہت مقروض تھا۔ اس نے درویش اور منجم کو امیر کے دروازے سے کامران آتے دیکھا تو وہ بھی وہاں جا پہنچا اور اپنی حاجت بیان کی۔ منجم نے اسے خلعت بخشی اور عزت سے رخصت کیا۔ شاعر نے یہ سناتو زمانے کا بہت شاکی ہوا کہ سخن کی قدر دنیا سے انھیں اور اس نے منجم کے پاس جا کر اپنا کلام سنایا اور انعام کا طالب ہوا۔ منجم اس کا کلام سن کر خوش ہوا اور اس کا منہ موتیوں سے بھردیا۔

درویش کو جو بول گیا تھا اس نے عزیز جانا کہ پھر فاقوں کی نوبت نہ آئے اور بخل کرنا شروع کر دیا۔ عالم نے اسی دولت سے کچھ پیس انداز کر کے کچھ اونٹ اور تھوڑا سا سباب خرید اور سو داگروں کے ہمراہ اصفہان جہاں ہے روانہ ہوا اس سفر میں اسے منافع ہوا۔ تب اس نے مزید اونٹ اور مزید سامان خریدا اور خراسان کا سفر کیا۔ دلنشدہ نے قرض لینے اور ادا کرنے میں بڑا تجربہ حاصل کیا اور اپناروپیہ چلانا شروع کر دیا۔ شاعر بہت کامل لکھا اس نے بس اتنا کیا کہ چند اشعار اور لکھ لئے۔ کچھ تہذیبی کچھ شکایتی اور اسے مزید انعام مل گیا اور یوں درویش عالم دلنشدہ اور سو داگر چاروں توکر ہو گئے مگر اس کے بعد ایسا ہوا کہ درویش کی درویشانہ شان عالم کا علم دلنشدہ کی داش اور شاعر کے کلام کی سرستی جاتی رہی۔

شیخ نے یہ حکایت سن کر توقف کیا۔ پھر فرمایا۔

حضرت شیخ سعدی نے بھی صحیح فرمایا اور میں شیخ مٹھاں کو تر بھی صحیح کہتا ہوں کہ مشق میں عشق فراموش دونوں صورت ہو ہے۔ پھر وہ دیر تک اس شعر کو گنتنگا تر رہے اور اس روز اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے شیخ کی طبیعت میں گداز تھا اور دل درد سے معمور شعر سنتے تھے تو کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جب بہت متاثر ہوتے تو رقت فرماتے اور گریبان چاک کر دلتے تھے۔ آخری

شعر جو آپ نے ساعت فرمایا اس کا ذکر قم کرتا ہوں۔

اس روز رات سے آپ پر اخبار کا عالم تھا۔ شب بیداری آپ کا شیوه تھا پر اس شب آپ نے گھری بھر بھی آرام نہیں فرمایا۔ میں نے گروش کی تو فرمایا کہ مسافروں کو نیند کہاں؟ اور پھر تجھ و تخلیل میں مستقر ہو گئے۔ انہی ترکا تھا اور آپ فجر کا فریضہ ادا کر پچک تھے کہ ایک فقیر پر سورج میں یہ شعر پڑھتا ہوا گزرا۔

آگے کو کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرانے دھرے دھرے

آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ فرمایا اے فلا نے یہ شعر پھر پڑھ۔ اس نے وہ شعر پھر پڑھا۔ آپ نے گریان چاک کر دیا۔ فرمایا اے فلا نے یہ شعر پھر پڑھ۔ فقیر نے شعر پھر پڑھا۔ آپ کا جی بھر آیا۔ دکھ بھری آواز میں بولے افسوس ہے۔ ان ہاتھوں پر بوجا اس کے جوانہوں نے مانگا۔ افسوس ہے کہ ان ہاتھوں پر بوجا اس کے جوانہوں نے پایا اور آپ نے اپنے ہاتھ پر نظر فرمائی اور گویا ہوئے کہ اے میرے ہاتھ گواہ رہنا کر شیخ مٹان کب تر نے تمہیں رسوائی سے محفوظ رکھا۔ وہ فقیر کہ تم نے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا نہ سن تھا۔ اندر آگیا اور شیخ سے مخاطب ہوا کہ اے عثمان اب مرنا چاہیے کہ ہاتھ سوالی ہو گئے۔ آپ نے یہ سن کر گری یہ کیا اور فرمایا۔ میں مر گیا اور پھر آپ نے ایسٹ پر سر رکھا اور چادر تان کر ساکت ہو گئے۔

آپ نے ایسٹ پر سر رکھ کر چادر تان لی اور آپ ساکت ہو گئے اور وہ فقیر جدھر سے آیا تھا دھر چلا گیا اور میں بالیں پر مشوش بیٹھا رہا۔ پھر مجھے لگا کہ چادر کے اندر کوئی شے پھر تکی ہے۔ میں نے چادر کا کوتہ اٹھایا۔ دفتار چادر کے اندر سے ایک سفید کبوتر پھر کر لکھا اور دم کے دم میں بلند ہو کر آسان میں گم ہو گیا اور میں نے چادر کا کوتہ اٹھا کر شیخ کے چہرہ مبارک پر نظر ڈالی۔ اس چہرہ مبارک پر اس آن عجب تھی۔ لگتا تھا کہ آپ خواب فرم رہے ہیں تب مجھ پر رقت طاری ہوئی اور میں نے یہ زاری کی کہ میں غش کر گیا۔

شیخ کے دصال شریف کا مجھ پر عجب اثر ہوا کہ میں اپنے جگرے میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔ دنیا سے جی پھر گیا اور ہم جنسوں سے مل بیٹھنے کی آرزو مٹ گئی۔ جانے میں کتنے دن مجرہ شیخ رہا۔ ایک شب شیخ اللہ ان کی قبر نور سے بھرے خواب میں تشریف لائے۔ آپ نے اوپ نظر فرمائی اور میں نے دیکھا کہ مجرے کی چھت کھل گئی ہے اور آسان دکھائی دے رہا ہے۔ اس خواب کو میں نے ہدایت جانا اور دوسرے دن مجرے سے باہر نکل آیا۔

جانے میں کتنے دن مجرہ شیخ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا ہی بد گئی ہے۔ بازار سے گزر اتوہ و رونق دیکھی کہ پہلے بھی نہ کبھی دیکھی

تحتی۔ ہزاری بزاری دکانیں صاف شفاف، صراف کے برابر صراف۔ سیکھوں کا سوداوم کے دم میں ہوتا ہے۔ سوداگروں کی خدائی ہے دولت کی گنگا بھتی ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا کہ یارب یہ عالم بیداری ہے یا خواب دیکھا ہوں؟ کس شہر میں آگیا ہوں؟ تب میں نے سوچا کہ جیر بجا یوں سے ملتا چاہیے۔ حقیقت حال معلوم کرنا چاہیے۔ میں نے پہلے خانہ برپا دیکھ رضی کا پڑھ لیا۔ ڈھونڈتا ڈھونڈتا شہر کے ایک خوشبو کوچے میں پہنچا اور ایک قصر کھڑا دیکھا۔ لوگوں نے کہا کہ سید رضی کا دولت کدھی ہے۔ میں نے اس قصر کو دیکھا اور چلا کر کہا کہ خدا کی قسم اے لوگوں تم نے مجھ سے جھوٹ کہا۔ سید رضی گھر بیٹیں بنا سکتا اور میں آگے بڑھ گیا۔ پھر میں نے ابو مسلم بندادی کا پڑھ لیا۔ ایک شخص نے مجھے قاضی شہر کی محل سڑائے کے سامنے جا کر کھڑا کیا اور کہا کہ ابو مسلم بندادی کا مسکن یہی ہے میں نے اس محل سڑائے کو دیکھا۔ اپنے تینیں حیران ہوا کہ ابو مسلم بندادی نے مرتبہ لے لیا۔ میں آگے بڑھ گیا اور شیخ حمزہ کا پڑھ لیا۔ شیخ حمزہ کا پڑھ لیتے ہیں نے خود کو پھر ایک حولی کے رو بروکھڑا پایا اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم شیخ حمزہ نے چھپت پاٹ لی۔ وہ مجھ سے دور ہو گیا۔ میں آگے بڑھا اور ابو جعفر شیرازی کا پڑھ پوچھا۔ تب ایک شخص نے مجھے ایک جو ہری کی دکان پر لے جا کھڑا کر دیا جہاں، قالمین پر گاؤں تک یہ سے کر لا کر ریشمی پوشاک میں ملبوس ابو جعفر شیرازی بیٹھا تھا اور وہ ایک طفیل خوب رو سے پنچھا کرتا تھا۔ تب میں نے چلا کر کہا اے ابو جعفر میں سے متاز ہو گئی اور میں جواب کا انتظار کئے بغیر ہر اور وہاں سے آگیا۔ راستہ میں میں نے دیکھا کہ سید رضی ریشمی پوشاک میں ملبوس غلاموں کے جلو میں بعد تھنکت سامنے سے چلا آتا ہے اور دامن صبر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے بڑھ کر اس کی عبا کے بھاری دامن کو انھیا اور کہا کہ اے بزرگ خاندان کی یادگار اے سید السادات تو نے ثاث چھوڑ کر ریشم اوڑھ لیا اس پر وہ بھجوپ ہوا اور میں وہاں سے روتا ہوا اپنے تجھے کی سمت چلا اور میں تجھہ میں آکر تا اور دیر رو یا اور کہا کہ خدا کی قسم میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

دوسرے دن میں نے شیخ کے مزار شریف پر حاضری کو گیم پوش اور بوریائشین پایا میں اس کے پاس بیٹھا اور کہا کہ اے جیب تو نے دیکھا کہ دنیا کس طرح بدی ہے اور رفتاء نے شیخ کی تعلیمات کو کیا فراموش کیا ہے اور کس طرح اپنے مسلک سے پھرے ہیں وہ یہ سن کر انہوں کے آثار چھرے پر لایا اور آہ سر و پھر کر بولا کہ بے شک دنیابدل گئی اور رفتاء نے شیخ کی تعلیمات کو فراموش کر دیا اور اپنے مسلک سے پھر گئے اور میں نے کہا کہ بلا کست ہو بندہ دینار کو اور بلا کست ہو بندہ درہم کو۔ اسی روز شام کو ابو مسلم بندادی کا قاصد مجھے بلانے آیا کہ چل تیرا پر انار قفق زلاتا ہے اور میں وہاں گیا تو میں نے جیب بن بیجنی ترمذی کو اس کی صحبت میں بیٹھا پایا اور ابو مسلم بندادی نے پیشانی پکن ڈال کے کہا کہ اے بوقام خضری تو ہمیں شیخ کی تعلیمات سے

مُنْعِرْفٌ ہاتا ہے اور بُلَاكَتٌ بُلَاكَتٌ کے نفرے گاتا ہے اس پر میں نے جیبیں بن بھی پر غصہ کی نظر ڈالی اور بھرا بُولِمْ بُخداوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ اے ابو مسلم کیا تو مجھے وہ کہنے سے منع کرے گا جو رسول نے کہا اور جسے شیخ نے ورد کیا اور میں نے پوری حدیث پڑھی۔

بُلَاكَتٌ ہو بندہ دینار کو اور بُلَاكَتٌ ہو بندہ درہم کو اور بُلَاكَتٌ ہو بندہ گیم سیاہ کو اور پچھے لباس کے بندے کو۔ اسی اثناء میں دستِ خوان، بچھا اور اس انواع دواوائیں کے کھانے پتے گئے۔ ابو مسلم بُخداوی نے کہا۔
اے رُفِیقِ تناول کر میں نے شنڈا پینے پر قیامت کی اور کہا۔

اے ابو مسلم بُخداوی دنیا دن ہے اور تم اس میں روزہ دار ہیں۔ ابو مسلم بُخداوی یہ سن کر روایا اور بولا:
”جس کہا تو نے اے ابو قاسم اور پھر کھانا تناول کیا اور حبیب بن بھی ترمذی بھی یہ سن کر روایا اور حبیب بن بھی ترمذی نے بھی بیٹھ بھر کر کھایا۔ جب دستِ خوان تھہہ واتو کنیزوں کے جلو میں ایک رقا صہ آئی میں اسے دیکھ کر اللہ کھڑا ہوا۔ ابو مسلم بُخداوی نے اصرار کیا کہ اے رُفِیقِ تھہہ۔ میں نے کہا کہ اے ابو مسلم بُخداوی دنیا دن ہے اور تم روزہ دار ہیں اور میں وہاں سے چلا آیا اور اس چھنان کے پیروں کی دھمک اور گلکلروؤں کی جھکار نے میرا عاقب کیا۔ پھر میں نے کافوں میں انگلیاں لے لیں اور بڑھے چلا گیا۔“

جب میں نے مجرے میں قدم رکھا تو دفعتاً ایک لگنی شے ترپ کر میرے حلق سے نکلی اور منہ سے باہر لکل آئی۔ میں نے چاغ روشن کیا اور جھرے کا کونہ کوئہ دیکھا اگر کچھ نہ کھانی دیا اور میں نے کہا۔
بے شک یہ میرا ہم تھا اور میں چنانی پر پہنچ کر سورہ۔

دوسرے روز میں اللہ کر حبیب بن بھی ترمذی کی طرف گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے بوریا پر ایک زرد کتا سورہ ہے۔ میں نے کہا:

”اے بھی کے بیٹے تو نے اپنے تینیں نفس کے حوالے کر دیا اور منافق ہو گیا۔ اس پر وہ رویا اور کہا کہ خدا کی قسم میں تیرے ساتھیوں میں سے ہوں اور رفقاء کے پاس ملک شیخ یاد دلانے جاتا ہوں۔ تب میں نے شیخ کی قبر پر کہ خدا اس کنور سے بھر دئے عقیدت مندوں کو زر و سیم چڑھاتے دیکھا اور میں نے کہا۔“

اے بھی کے بیٹے تیرا ہو تو نے شیخ کو وصال کے بعد اہل زربنا دیا۔ اس زر و سیم کا تو کیا کرتا ہے؟ حبیب بن ترمذی بھر رویا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ زر و سیم سید رضی ایوب حضری شیرازی ابو مسلم بُخداوی شیخ حمزہ اور میرے درمیان مساوی قسم ہوتا ہے اور میں اپنا

حصہ مسکین میں تقسیم کر دیا ہوں اور بوریا کو اپنی لender جانتا ہوں۔

میں وہاں سے انھوں کر آگے چلا اور میں نے سید رضی کے قصر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے چالانک میں ایک بڑا زرد کتا کھڑا ہے اور میں نے اس زرد کتے کو شیخ حمزہ کی حوصلی کے سامنے کھڑا پایا اور ابو عفری شیرازی کی مند پر گھونخواب پایا اور ابو مسلم بندادوی کی محل میں دم اٹھائے کھڑے دیکھا اور میں نے کہا:

”شیخ تمہرے مرید زرد کتے کی پاہ میں چلے گئے اور میں اس رات پھر ابو مسلم بندادوی کی محل سرا میں گیا اور میں نے اپنے تینس سوال کیا۔ ابے ابو قاسم تو ہبہاں کیوں آیا ہے؟ اور ابو قاسم نے مجھ سے کہا کہ ابو مسلم بندادوی کو مسلک شیخ کی دعوت دینے کے لئے۔ اس رات بھی میں نے حبیب بن بخشی ترمذی کو ابو مسلم بندادوی کے دستخوان پر موجود پایا۔ ابو مسلم بندادوی نے مجھ سے کہا اے رفیق کھانا تناول کر اور میں نے شخذانے پانی پر قیامت کی اور کہا کہ اے ابو مسلم دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔ اس پر ابو مسلم بندادوی رویا اور بولا:

”جس کہا تو نے اے رفیق اور پھر کھانا تناول کیا اور حبیب بن بخشی ترمذی بھی رو یا اور حبیب بن بخشی ترمذی نے بھی پیٹ پھر کر کھانا کھایا۔ پھر جب زن رقصہ آئی جب بھی میں نے بھی کہا کہ اور انھوں کھڑا ہوا اور اس زن رقصہ کے بیرون کی تھاپ اور گلگھڑوں کی جگہ کارنے کچھ درجک میر اتحاقد کیا مگر میں نے کاٹوں میں انگلیاں دے لیں اور آگے بڑھ گیا۔

تیرے دن میں نے پھر گشت کیا اور جو مظہر پکھلے دو دن دیکھتا آ رہا تھا اس میں سر موافق شد دیکھا اور شب کو میں نے پھر اپنے تینس ابو مسلم بندادوی کے در پر کھڑا پایا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابو مسلم بندادوی کو شیخ کی تعلیمات یاد دلانے آیا ہوں۔ سو میں نے اپنے تینس کوئی سوال نہیں کیا اور اندر چلا گیا۔ آج پھر حبیب بن بخشی ترمذی دستخوان پر موجود تھا۔ ابو مسلم بندادوی نے کہا اے رفیق کھانا تناول کر اور مجھے آج تیرا فاقہ تھا اور دستخوان پر مجملہ غذاوں کے معزف بھی تھا جو ایک زمانہ میں مجھے بہت مرغوب تھا۔ میں نے ایک نوالہ عذر کا لے کر ہاتھ کھٹکایا اور شخذانے پانی بیٹا اور کھانا دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔

آج یہ فقرہ سن کر ابو مسلم بندادوی نے رونے کے ہبائے الہمیناں کا ساریں لیا اور کہا اے رفیق تو نے جس کہا پھر زن رقصہ آئی اور میں نے اسے ایک نظر دیکھا چہرہ لال بھجوکا آنکھیں سے کی بیالیاں، کپیں سخت اور رانیں بھری ہوئیں۔ پیٹ صندل کی تختی، ناف گول پیالہ ایسی اور لباس اس نے اسیا پر ایک پہننا تھا کہ صندل کی تختی اور گول پیالہ اور کوئی بیکیں ساقیں سب نہایاں تھیں اور مجھے لگا کہ میں نے مکہتے عذر کا ایک اور نوالہ لے لیا ہے اور میرے پوروؤں میں کن من ہونے لگی اور میرے ہاتھ میرے اختیار سے باہر

ہونے لگے۔ تب مجھے ہاتھوں کے بارے میں شیخ کا ارشاد یاد آیا۔ میں گھبرا کر انٹھ کھڑا ہوا کہ آج ابو مسلم بغدادی نے کھانے پر اصرار نکیا اور آج اس رندی کے بیرون کی تحفہ اور گھنگھروں کی جھنکارنے ایک شیریں کیفیت کے ساتھ میر اور تک تعاقب کیا۔ جب میں گھر پہنچا اور جھرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پورے پر ایک زرد کتا سور ہا ہے۔ میں تو اسے دیکھنے کا بھر بن گیا اور مجھے شدھا اللہ عزیز اپسین آنے لگا۔ پھر میں نے اسے مارا پھر وہ بھاگنے کی بجائے میرے دام میں آ کر گم ہو گیا۔ تب مجھے اندر یشوں اور وسوسوں نے آ گھیرا میری آنکھوں کی نیند غائب اور دل کا چیلن رخصت ہو گیا اور میں نے زاری کی۔ اے میرے مجبود مجھ پر حم کر میر اول آ لاکشوں میں جتنا ہوا اور زرد کتا میرے اندر سا گیا۔ میں نے زاری کی اور میں نے دعا کی پر میرے ہی کو قرار دا یا یکبارگی مجھے ابوعلی روڈ باری رضی اللہ عنہ یاد آئے کہ کچھ حدود و سوسکی یہاری میں جتنا رہے تھے ایک دن وہ صحن نور کے ترکے دریا پر گئے اور سورج نکلتے تک وہاں رہے۔ اس عرصہ میں ان کا دل اندوہ گیس ہوا۔ انہوں نے عرض کیا۔ اے بار خدا یا آرام دے۔ دریا میں سے ہاتھ نے آواز دی کہ آرام علم میں ہے اور میں نے خود سے کہا اے ابو قاسم خضری یہاں سے چل کر یہاں تیرے باہر اور اندر زرد کتے پیدا ہو گئے اور تیرا آرام چھن گیا۔

میں نے اپنے جھرے پر آخری نظر ڈالی اور منطق اور فقہ کی ان نادر کتب کو جو برسوں کی ریاضت سے جمع کی تھیں، وہیں چھوڑا۔ ملفوظات شیخ بغل میں دیا شہر سے نکل گیا۔ شہر سے نکلتے نکلتے زمین نے میرے پیر کپڑا لئے اور مجھے شیخ کی خوشبو جملیں بے طرح یاد آ گئیں اور اس زمین نے جیسے میں نے پاک اور مقدس جانا تھا، مجھے بہت کپڑا اور ان گیوں نے جنہوں نے شیخ کے قدموں کو بوسہ دیا تھا مجھے، بہت پکار اور میں ان کی پکار سن کر روپیا اور بکا کی کہ یا شیخ تیر شہر چتوں میں چھپ گیا اور آسمان دور ہو گیا اور تیرے رفتہ ان گریز پا تجھ سے پھر گئے۔ انہوں نے لاثر یک چھپت کے مقابل اپنی اپنی چھپتیں پاٹ لیں اور مٹی اور مٹی میں فصل پیدا کر دیا اور زرد کتے نے عزت پائی اور اشرفِ اعلیٰ میں بن گیا اور مجھ پر تیر اشیک چھپ ہو گیا میں نے تیر اشیک چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر میں نے دل مخفبوط کیا اور جل چڑا۔ میں چلتے چلتے دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ میرا دم پھول گیا اور میرے بیرون میں چھالے چڑے گئے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ اچانک میرے طلق سے کوئی چیز زور کر کے باہر آ گئی اور بیرون پر گر گئی۔ میں نے اپنے بیرون پر نظر کی اور یہ دیکھ کر جی ان رہ گیا کہ ایک اومڑی کا پچ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ تب میں نے اسے بیرون سے کھوند کر کچل دینا چاہا اور وہ اومڑی کا پچ پھول کر موتا ہو گیا۔ تب میں نے اسے پھر قدموں سے کھوندا اور وہ اور موتا ہو گیا اور موتا ہوتے ہوئے زرد کتا بن گیا۔ تب میں نے پوری قوت سے زرد کتے کو شوکر ماری اور اسے قدموں سے خوب رومندا اور رومندا ہوا آگے نکل گیا اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے اپنے زرد کتے کو رومندا لَا

اور میں چلتا ہی گیا تا آنکے میرے پچانے چھل کر پھوڑا ہیں گے اور میرے ہیروں کی انکیاں پھٹ گئیں اور توکے لہو لہاں ہو گئے
پھر ایسا ہوا کہ زرد کتا ہے میں رومند کرا یا تھا جانے کدھر سے پھر کل آیا اور میرا است روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں اسے لڑا اور اسے راہ سے
بہت ہٹایا۔ پر وہ راہ سے سرمند ہٹا حتیٰ کہ میں تحکم گیا اور میں تحکم کر گھٹ گیا اور وہ زرد کتا پھول کر بڑا ہو گیا۔ تب میں نے بارگاہ
رب العزت میں فریاد کی کہاے پائے والے آدمی گھٹ گیا اور میں نے اسے قدموں میں رومندنا چالا پر وہ میرے
دامن میں لپٹ کر غائب ہو گیا اور میں نے اپنی پھٹی ہوئی انکلیوں اور لہو لہاں آنکوں اور پھوڑا چھالوں پر نظر کی اور اپنے حال پر روایا اور
کہا کہ کاش میں نے شیخ کے شہر سے بھرت نکی کہ ہوتی۔ تب میرا دھیان اور طرف گیا۔ میں نے مکہتے مرغیر کا خیال کیا اور صندل کی
تحتی اور گول بیال والی کا تصور باندھا اور شیخ کے مزار پر زر و سیم کی بارش پر قیاس دوڑایا اور میں نے سوچا کہ بے شک شیخ کے مزار پر
زر و سیم سے مخفف ہو گئے اور حبیب بن بیکی ترمذی نے مناقبت کی راہ اختیار کی اور بے شک شیخ کے ملفوظات پر نظر ٹھانی کروں اور
انہیں مرغوب غلائق اور پسند خاطر احباب بتا کر ان کی اشاعت کی تدبیر کروں اور شیخ کا تذکرہ اس طرح لکھوں کہ رفقاء کو پسند آئے اور
طبیعت پر کسی کی میل نہ آئے پر مجھے اس آن اچانک شیخ کا ارشاد یاد آیا کہ ہاتھ آدمی کے دمکن ہیں اور میں نے سوچا کہ میرے ہاتھ
مجھ سے دشمنی کریں گے اور اسی رات جب میں نے سونے کی نیت باندھی تو میں نے دیکھا کہ زرد کتا پھر خود اور ہو گیا ہے اور میری چٹائی
پر سور ہاہے۔ تب میں نے زرد کتے کو مارا اور اسے اپنی چٹائی سے اٹھانے کے لئے اس سے نہ ردا آزماء ہوا اور میں اور زرد کتات رات بھر
لڑتے رہے کبھی میں اسے قدموں میں رومند ڈالتا اور وہ چھوٹا اور میں بڑا ہو جاتا۔ کبھی وہ انٹھ کھڑا ہوتا اور میں چھوٹا اور وہ بڑا ہو جاتا۔
یہاں تک کہن جو گئی اور اس کا زور گھنٹے لگا اور وہ میرے دامن میں چھپ کر غائب ہو گیا۔

تب سے اب تک میری اور زرد کتے کی لڑائی چلی آتی ہے۔ اس مجاہدہ کی فرمیں بہت اور باریکیاں بے شمار ہیں جنہیں میں
نظر انداز کرتا ہوں کہ رسالہ لہاں ہو جائے کبھی زرد کتا مجھ پر اور کبھی میں زرد کتے پر غالب آ جاتا ہوں۔ کبھی میں بڑا ہوتا ہوں اور وہ
میرے قدموں میں پس کر لو مژدی کا بچا ایسا رہ جاتا ہے کبھی وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے اور میں گھنے چلا جاتا ہوں اور مجھے مکہتے ہوئے مرغیر
اور صندل کی تھتی اور گول بیال والے کا خیال ستائے گلتا ہے اور زرد کتا کہتا ہے کہ جب سب زرد کتے بن جائیں تو آدمی بنے رہتا کتے سے
بدتر ہوتا ہے اور میں فریاد کرتا ہوں کہ اے پائے والے میں کب تک درختوں کے سائے میں بنی آدم سے دور دور پھر وہ اور کچے کچے
چھالوں اور موٹے ٹاٹ کی گذڑی پر گزارہ کروں اور میرے قدم شہر کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ پر مجھے شیخ کا ارشاد یاد آ جاتا ہے کہ واپس
ہوتے ہوئے قدم سالک کے دمکن ہیں اور میں پھر اپنے قدموں کو سزا دیتا ہوں اور شہر کی طرف پشت کر کے اتنا چلتا ہوں کہ میرے

تکوے لہلہان ہوجاتے ہیں اور پھر ہاتھوں کی سزاد چاہوں کو راستے کے پتھر کلکر چتا ہوں۔ اے رب اعزت میں نے اپنے دشمنوں کو اتنی سزادی کہ میرے تکوے لہلہان ہو گئے اور میرے پروے کلکر چنتے چنتے پھوڑا بن گئے اور میری چجزی دھوپ میں کالی پر گئی اور میری بڈیاں پکھلنگیں۔ اے رب اعزت میری نیندیں جل گئیں اور میرے دن ملایا میٹ ہو گئے۔ دنیا میرے لئے تپتا دن بن گئی اور میں روزہ دار پتھر اور روزہ دن دن لبا ہوتا جاتا ہے۔ اس روز سے میں لا غر ہو گیا مگر زر کتا تو انہے اور روزات کو میری چٹائی پر آرام کرتا ہے۔ میر آرام رخصت ہو گیا اور میری چٹائی خیر کے قبضہ میں چل گئی اور زر کتا بڑا اور آدمی حصیر ہو گیا اور اس وقت میں نے ابوعلی روڈ باری رضی اللہ عنہ کو پھر بکا کی اور دریا کے کنارے دوز اونیجھ گلیا میرا دل اندر سے بھرا ہوا تھا اور میں نے بکا کی بار الہا آرام دے آرام دے آرام دے میں نے رات بھر بکا کی اور دریا کی طرف دیکھا کیا اور رات بھر غبار آلو دیجیر ہوا زر در و پیڑوں کے درمیان چلا کی اور رات بھر درختوں سے پتے گرائے میں نے دریا سے نظر ہٹا کر اپنے گرد میں ائے جسم کو دیکھا اپنے اروگرد زر دیتوں کی ڈھیر یاں دیکھیں اور میں نے کہا کہ یہ میری خواہشیں اور ارمان ہیں۔ خدا کی قسم میں آلاکشوں سے پاک ہوا اور پت جھنڑ کا برہن درخت بن گیا پر جب تذکرہ ہوا تو مجھے اپنے پرواؤں میں میٹھا میٹھا رس گھلتا محسوس ہوا جیسے وہ مندل کی جنتی سے چھو گئے ہیں جیسے انہوں نے گول شہری بیالے اور نرم نرم چاندی ساقوں کو س کیا ہے جیسے انگلیاں سونے چاندی میں کھیل رہی ہیں اور ان کے درمیان درہم و دینار کھنک رہے ہیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور دھنڈ لکے میں یہ دیشت بھرا منظر دیکھا کہ زر کتا دم اٹھائے اس طور کھڑا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں شہر میں ہیں اور اگلی ٹانگیں میری چٹائی پر اور اس کے گلے گرم نخنے میرے دا گیں ہاتھ کی انگلیوں کو چھو رہے ہیں۔ میں نے اپنے دا گیں ہاتھ کو یوں دیکھا جیسے وہ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کی مشال کثا ہوا مجھے سے الگ چڑا ہے اور میں نے اسے خطاب کر کے کہا کہ اے میرے ہاتھاے میرے رفیق تو دشمن سے مل گیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گزگڑا کر ایک پھر دعا کی۔

بار الہا آرام دے۔ آرام دے۔ آرام دے۔



پرچھائیں

وہ تم تھا، اس نے سوچا درد یوں بھی کہتی ہوا ہے؟ اس نے اپنی بیک درست کی اور رومال سے گردن کو پوچھا۔ اتنی سی دیر میں وہ پہنچنے سے تر بترا ہو گیا تھا۔ ول اب بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا لیکن دھڑکنوں کے درمیان وقٹے لبے ہو گئے تھے۔ اب اسے پیشمانی ہو رہی تھی کہ محض ایک وہم پر وہ بھاگ کھڑا ہوا جانے کی آخ رکیا تھک تھی؟ کوئی اسے پکڑے لے رہا تھا؟ وہ کوئی مجرم تو نہیں تھا؟ یا اس نے کسی کو قتل کیا تھا؟ اس نے طے کیا کہ بہتر ہے پلت کر چلا اور اطمینان کر لو رونہ خواہ ٹوٹا ایک وہم ہو جائے گا۔

جب وہ دوبارہ ہوٹل میں داخل ہوا تو یوں وہ بالکل بھر بیا ہوا نہیں تھا۔ مگر دل آپ ہی آپ پھر قدرے زور سے دھڑکنے لگا اور قدم بھاری ہونے لگے۔ تاہم اس نے اس کیفیت پر فوراً ہی تابو پالیا اور بڑے اختداد سے اندر واپس ہوا۔ اندر واپس ہو کر اس نے اس میز پر نظر ڈالی جہاں وہ اسے بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا کہاں گیا وہ؟ اتنی جلدی کیسے جاسکتا ہے؟ تعارف کرنے سے ذرا ہی پہلے تو اس نے آرڈر دیا تھا؟ اتنی جلدی کھانا بھی آگیا اور کھا بھی لیا اور چلا بھی گیا؟ نہیں شاید کلی کرنے با تحریر میں گیا ہو؟ وہ اس میز سے قریب ہی ایک خالی میز پر جا بیٹھا اور اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ مگر وہ اخبار کیا پڑھ رہا تھا انکھیوں سے با تحریر کے دروازے کو زیادہ دیکھتا جا رہا تھا پھر با تحریر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص عجلت سے کل کر رومال سے ہاتھ پوچھتا ہوا ایک میز کی طرف چلا اور چائے پینے والوں کے حلے میں شامل ہو گیا اور کہاں گیا؟ اب اسے واقعی تجہب ہونے لگا۔ اتنی جلدی کھانا کھا آئیں گیا اور بال ہمیں ادا کر دیا اور چلا بھی گیا۔ آدمی تھا یا سایہ؟ اخبار وہیں چھوڑ کر وہ انٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ مجرم سے پوچھ لیا جائے مگر پھر وہ یہ سوچ کر چب ہو گیا کہ اتنے گا کہوں میں اسے کہاں یاد ہو گا کہ کون آیا اور کون گیا اور یوں بھی یہ بات ایسی مناسب نہیں جانے کوئی کیا سمجھے وہ تجزی سے باہر کل گیا۔

اس نے سائیکل شینڈ کو ایک نظر دیکھا اور سائیکل سنjalے والوں میں سے ایک ایک چہرے کا جائزہ لیا۔ پھر سڑک پر نظر ماری۔

پھر وہ حیران اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایک نام کے دو کیا ہوتے نہیں۔ اس نے اپنے آپ سے استدلال کیا بلکہ ایک نام کے کئی کمی ہوتے ہیں اور بعض نام تو اتنے پیش پانی تھے جس میں دو دو تین تین آدمی اس نام کے لگل آتے ہیں۔ مگر ایک شکل کے بھی دو ہو سکتے ہیں؟ اس پر وہ کھل گیا۔ ایک دفعہ پھر تصوڑی دیر کے لئے اس کی سمجھ معطل ہو گئی آنکھوں میں پھر وہ تصویر پھر گئی۔ چائے پینے اور ساتھ میں اخبار پڑھنے میں وہ پہلے اتنا مست رہا کہ اس کو طرف نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔ ہوں ہو یا گاڑی کا سفر سے اجنبیوں سے تعارف کرتے ہوئے ہمیشہ وہست ہوئی مگر جب تعارف کرتے ہوئے اس شخص نے اپنا نام بتایا تو اس کے کان کھڑے ہوئے یہ تو میرا نام ہے۔ اس نے چونکہ کراس پر نظر ڈالی وہ سکتے میں آگیا اور اس کی پتلیاں پھیلتی چل گئیں۔ اس کی تو شکل و صورت بھی میں میں وہ پھر سرے پیور لگ کا انپ گیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ چل کیا رہا تھا بھاگ رہا تھا۔ ایک تصویر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ اس کی زد سے پرے لگل جانا چاہتا تھا۔ میں کیوں بھاگ رہا ہوں؟ میں نے قید خانے کی دیوار تو نہیں بچا نہیں ہے یا میں نے کوئی قتل کیا ہے؟ اس کی چال ڈھیل پڑ گئی اب وہ اپنی بدھواںی پر بھی قابو پا چلا تھا اور ٹھنڈے دل سے سوچ رہا تھا یہ بھی تو ہو سکتا ہو کہ ہم ناگی نے ہمشکلی کا طسم کھڑا کیا ہو پھر اس نے سوچا کہ آخر ہمشکل ہونا بھی ناممکنات سے تو نہیں۔ آدمی آدمی سے مشاہدہ رکھتا ہے ہر حال وہ اس کا ہمشکل نہیں تھا۔ اس نے قطعی انداز میں دل ہی دل میں کہا شخص تصویر تھا۔ برآمدے میں داخل ہو کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلا۔ پھر اسے اچانک خیال آیا کہ کل جب وہ گھر سے باہر رکھا تو اسے کوئی پوچھنے آیا تھا اور وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹا اور بڑے کمرے میں ہوتا ہوا ٹھنڈی میں نگل گیا۔

اماں جی مجھے کوئی پوچھنے تو نہیں آیا تھا؟
نہیں تو۔

کل کون تھا جاؤ یا تھا؟
میں کیا جانوں کون تھا؟ کچھ بتا کے تو گیا نہیں۔

نام نہیں بتایا؟
نہیں۔

نام نہیں بتایا اچھا وہ رکتے ہوئے بولا۔
کس شکل و صورت کا تھا۔

مخدودی کو کیا خرکیسی صورت شکل تھی۔ میں کوئی باہر کل کے اسے دیکھنے کی تھی۔ پھر اس بے تک سوال پر وہ بھی پڑھا گیا۔
کون تھا، کیوں آیا تھا؟ کوئی دوست، مگر دوست تو تقریباً سب ہی روز ملتے ہیں۔ کل شام بھی ملے تھے کسی نے ذکر نہیں کیا کہ میں تمہارے گھر ملنے گیا تھا کوئی ملے والا؟ لیکن اگر ملنا ہی مقصود تھا تو ایک دفعہ عدم موجودگی میں گھر کا پھیرا لگ جانا اور پھر سرے سے غائب ہی ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ آدمی تھا کہ سایہ اسی اوپریز بن میں اسے مصباح الدین کی بات یاد آئی کہ پرسوں اسے کوئی کافی میں ڈھونڈتا پھر تھا۔ اسے کریڈ ہونے لگی کہ آخر کون بھلامائس ہے کہ جہاں میں نہیں جاتا ہوں۔ وہاں وہ مجھے ڈھونڈتا ہے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے باہر کی طرف مڑ گیا۔ اس کا رخ مصباح الدین کے گھر کی طرف تھا۔ یا رصباح الدین کون آیا تھا۔
پرسوں مجھے ڈھونڈتے؟

یہ مجھے معلوم نہیں ویسے میں نے تمہیں تلاش بہت کیا۔

نام بتایا تھا۔

نام تنوہیں بتایا۔

کس شکل و صورت کا آدمی تھا؟

شکل و صورت؟ مصباح الدین الجھن میں پڑ گیا۔

میرا مطلب ہے کیا حلیہ تھا؟ اس نے فوراً واضحت کی۔

یا رہات یہ ہے کہ میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس نے ان سوالوں سے گویا چچا چھڑا تے ہوئے کہا:

”میں نے سچ کو ایک شخص سے بتیں کرتے دیکھا تھا مگر میں نے کچھ دھیان نہیں کیا بعد میں سچ نے آ کر کہا کہ یا را ایک شخص حسن کو ڈھونڈتا پھر تھا۔ میں نے کہا آج بھی وہ آیا نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ دکھائی نہیں دیا پھر ہم کا اس میں چلے گئے۔“

اس بیان سے اس کی تسلیم نہیں ہوئی۔ بلکہ بے اطمینانی کچھ اور بڑھ کئی۔ گھٹری پھر وہ سوچ میں ڈوبا کھڑا رہا پھر ایک اکی بولا۔

اچھا بھی میں چلا۔

کہاں؟ ابھی سے۔

نہیں بھی میں چلوں گا۔ سچ کی طرف جاؤں گا ذرا۔

یا تو عجب آدمی ہے۔ میاں چنے غرض ہے وہ خود آکر ملے گا۔ میں تو بھی پرواہ کرتا نہیں کہ کون مجھے پوچھنے آیا تھا اپنا اصول یہ ہے کہ چنے تیری تلاش ہے وہ خود تجھے ڈھونڈ لے گا۔

نہیں یار جانے کون ہو۔ اور کیا خبر ہے کوئی ضروری تھی بات ہو۔

مصباح الدین کے گھر سے چل کر قدم بڑا تا ہوا وہ سعی کے گھر پہنچا سعی صاحب اس نے دروازہ زور سے کھکھایا۔

پہلے قدموں کی چاپ سنائی دی پھر دروازہ کھلا اور سعی باہر ٹکل آیا۔ آؤ بھی اس نے سارے آداب اور تکلفات کو برطرف کر کے سید حساساں کیا۔ یا پرسوں میں تو کافی آیا نہیں تھا۔ مصباح کہتا تھا کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا تھا کون تھا؟

ہاں یا را یک صاحب تھے۔ انہوں نے تمہیں بہت ڈھونڈا بعد میں پتا چلا کہ تم کافی ہی نہیں آئے ہو۔

کیا نام تھا؟

نام! نام تو نہیں بتایا۔

ٹھکل کیسی تھی؟

ٹھکل۔۔۔ ٹھکل سعی اپنے حافظے پر زور دینے لگا۔

چھپری ابدان تھا؟ جیسا میں ہوں۔

سعی نے فوراً تائید کی ہاں ہاں۔

عینک لگتا تھا؟

عینک؟ سعی سمجھا تھا کہ اس کی گلوخاصی ہو گئی ہے۔ فوراً ہی دوسرا سوال ہونے پر وہ گزر بڑا ہو گیا عینک! ہاں شاید پھر فوراً ہی اس

نے اس جھیلے سے چمکا راپا نے کی راہ نکالی۔ یا کچھ جو دھیان نہیں۔ بہر حال وہ تمہارے گھر پہنچے گا۔

اچھا، پھر وہ رک کر بولا یا را گھر بھی کل کوئی آیا تھا۔ اس وقت میں کافی میں تھا۔ کوئی عجب غصہ ہے کہ جس وقت جہاں میں نہیں ہوتا اس وقت وہاں جا کر وہ مجھے ڈھونڈتا ہے۔

ویسے وہ صاحب ایڈورڈ ہوٹل میں بھرے ہوئے ہیں۔

ایڈورڈ ہوٹل میں! کون سے کمرے میں؟

اس سوال پر سعی پھر کھلیل گیا۔

کرے کا نمبر تو بتایا نہیں۔ بھی تصدیق ہے کہ میں نے مصباح الدین سے آکر پوچھا کہ حسن کیا ہے؟ اس نے کہا کہ تم کافی ہی نہیں آئے ہو تب مجھے خیال آیا کہ انہیں بتادیا جائے اور ان سے اتنا پتا پوچھ لیا جائے مگر وہ صاحب ایسے غائب ہوئے کہ کہیں نظری ہی نہیں آئے۔ بہر حال باتوں میں ایڈورڈ ہوٹل کا انہوں نے ذکر کیا تھا کہ اس کی اپر سوری پروہنہ ہے ہوئے ہیں۔ اپر سوری میں پھر تو شاید پتا چل جائے۔ اس نے اسی تفصیل کو اس وقت بہت فیضت سمجھا۔

میرا تو خیال ہے سچتے نہ کہا۔
وہ پھر تمہارے گھر آئیں گے اگر ملتا ہے تو ناچا ہے۔
اس نے بھی تائید کی۔

ہاں قاعدے سے تو انہیں پھر کسی وقت گھر کا پھیر الگنا چاہیے۔ اچھا بھی میں چلا۔ اور یہ فحصی جملہ اس نے بے سانگی سے کہا کہ سچا اس پر کچھ بھی تو نہیں کہہ سکا۔

سچتے رہ رخصت ہو کر اس نے یہی سوچا تھا کہ بہتر ہے گھر چلو۔ جسے ملتا ہے وہ گھر آ جائے مگر بس میں نہیں سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ایڈورڈ ہوٹل کی طرف جانے والی بس کھڑی ہے اور اس نے سوچا کہ بس مل گئی ہے تو کیوں نہ ایڈورڈ ہوٹل کا ایک چکر الگالیا۔ اے آخوندیر ہی کتنی لگے گی اور وہ جھٹ پٹ بس میں سوار ہو گیا۔

بس میں سوار ہونے کے بعد جب اس کی نظر کذبیکش پر پڑی تو اسے ایک ذرا تعجب ہوا کہ جب وہ سچ بس میں چلا تھا تو اس وقت بھی یہی کذبیکش تھا اور اب پھر اسی کذبیکش سے مدد بھیز ہو گئی تھی۔ اس نے بسوں کے سفر کے اپنے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوچا کہ ایسا اتفاق تو خیر اکثر ہو جایا کرتا ہے کہ جس بس سے سچ کو چلے ہیں وہی بس واپسی میں ملتی ہے اور پھر اسی کذبیکش سے مدد بھیز ہو جاتی ہے اور اس پر تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بھی کذبیکش کی طرح ہمسفر سے بھی دوبارہ مدد بھیز ہو جاتی ہے۔ اس خیال کی تقریب سے اسے اپنا پچھلے میئنے والا سفر یاد آ گیا کہ ایک شخص کو جس نے اسے لاری میں اپنے پاس کی انشت پر بیٹھے دیکھا تھا۔ شہر پہنچ کر دوسرے دن بازار میں ایک ہوٹل سے نکلتے دیکھا اور جب تیرے دن وہ واپس ہو رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ وہی شخص اس کے پیچے والی انشت پر بیٹھا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ ہمسفر بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں جو نہ پہلے کبھی دیکھے ہوئے ہوتے ہیں نہ بعد میں کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ سفر میں تھوڑے عرصے کے لئے ملتے ہیں۔ خوب شیر و شکر ہو جاتے ہیں اور پھر اسکل ہو جاتے ہیں اور ایسے ہمسفر بھی ہوتے ہیں جو سفر کے بعد بھی کئی موڑوں پر خلاف توقع دکھائی دیتے ہیں اس کے باوجود اپنی رہتی ہیں اور اس نے دل میں

کہا کہ ہمسفر بہر صورت ایک بھی ہے تھمسفر کا ایک دفعہ نظر آ کر پھر بھی نظر نہ آتا بھی ایک بھی ہے اور ایک دفعہ نظر آ کر دوبارہ نظر آتا بھی بھی ہے۔ اس خیال کے ساتھ اس کے اندر ایک حیرت جانے لگی تھی اور طرح طرح کے دھیان آنے لگے تھے کہ اتنے میں ایڈیورڈ ہوٹل والا ایس ٹاپ آگیا اور دھیان اس کا بٹ گیا۔ وہ جھٹ پٹ لس سے اتر اور سامنے والی کپی سرخ عمارت میں داخل ہو گیا۔ زینے کی اندر ہی روشنی میں چڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عمارت باہر سے تو نہیں ہونے کا دھوکہ دیتی ہے اندر آئیے تو مگن ہوتا ہے کہ باہر آدم کے زمانے میں تھی ہوگی۔ جانے کن خیالوں میں گم وہ چڑھتا چلا گیا اور لیکا یہک زینے سے لکھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہ ایک لمبی چوڑی اندر ہیری چھٹ پر نکل آیا ہے۔ پہلے تو اس کا دھک سے رہ گیا پھر اسے فوراً ہی خیال آیا کہ تو اس سے پہلے موڑ پر برآمدے میں اتر جانا چاہیے تھا۔ وہ ائلے پاؤں تیزی سے اتر اور پہلا موڑ آنے پر ایک لمبے برآمدے میں اتر گیا برآمدہ اس سرے سے اس سرے تک خالی اور خاموش تھا یہاں آخری سرے پر اس نے دیکھا کہ ایک شخص موڑ کر دوسرے برآمدے میں داخل ہوا ہے مگر وہ اس کی طرف اوچل ہوتی ہوئی پشت دیکھے سکا۔

وہ کروں پر احتیاط سے نظر ڈالتا ہوا چلنے لگا۔ ان کروں نے اسے چکرا دیا آخرون سا کرہ ہو سکتا ہے؟ کس سے پوچھا جائے؟ کس نام سے پوچھا جائے؟ کروں کے دروازے بالعموم بند تھے۔ کسی کمرے میں اندر ہیرا تھا اور باہر قفل پر اتحا تو کسی کمرے کے میلے شیئے اندر جلتی ہوئی بکلی سے پہلے پہلے ہو رہے تھے۔ ایک کمرے کا ایک پٹ اُک ڈرالکھلا ہوا تھا اس نے بہت احتیاط سے اس کے اندر نظر کی، مگر جتنے حصے تک اس کی نظر گئی اتنے حصے تک کوئی آدم زاد نظر نہیں آیا۔ ان اندر ہیرے اور منور کروں کے سامنے سے گزرتا ہوا جب وہ موڑ کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک کمرے کا دروازہ چھپٹ کھلا ہے۔ بکلی روشن ہے ایک بستے سے آرستہ پنگ اور سامنے اس کے ایک کمرے میں کوئی نہیں ہے اسے کرید ہوئی کہ اس کمرے کا مکین کون ہے۔ کہاں گیا ہے اور اتنی بے پرواہی کیوں کہ کمرے کے کوڑا چھپٹ کھلے چھوڑ دیئے ہیں۔ برآمدے کے موڑ پر مرتے ہوئے اس شخص کا خیال آیا جو اس موڑ پر موڑ کر اوچل ہو گیا تھا کہاں گیا وہ؟

موڑ مزدہ دوسرے برآمدے میں چلنے لگا کہ پچھلے برآمدے کی طرح خالی اور خاموش تھا اور اندر سے بند روشن کمرے اور باہر سے مقفل تاریک کمرے قطار کی صورت دور تک چلے گئے تھے۔ وہ برآمدے کے آخری سرے تک گیا۔ آخری سرے پر ایک اندر ہیرے زینے کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے یہاں تو بہت اندر ہیرا ہے اور اس خیال کے ساتھ آگے چیچھے کئی سوال اس کے دماغ میں پیدا ہوئے۔ اس زینے میں روشنی کیوں نہیں ہے؟ کیا یہ زید استعمال میں نہیں آتا۔ استعمال میں نہیں آتا تو کھلا ہوا کیوں ہے؟ یہ

زینہ کہاں اترتا ہے؟ وہ دہاں سے واپس ہو چڑا۔

واپسی میں جب وہ مزکر پہلے والے برآمدے میں داخل ہوا تو اس کی نظر پھر اس کھلے کمرے پر پڑی۔ جہاں ایک خالی کرسی اور بستہ سے آراستہ پنگل پڑا تھا۔ باہر سے جب حد تک اس کمرے کا جائزہ لیا جا سکتا تھا اس حد تک اس کا جائزہ لیتا ہوا وہ آگے نکل گیا۔ ایک اندر سے بند کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے گمان ہوا کہ اندر کچھ لوگ باتیں کر رہے ہیں اس نے اپنی رفتار سٹ کر دی اور کمرے کے برابر سے چلنے لگا۔ اسے سنائی تو کچھ نہ دیا ہاں یہ شک ضرور ہوا کہ بولنے والوں نے بولنے بولنے اپنا نکاح جو دھیما کر لیا ہے اور اس نکاح کا اثر یہ ہوا کہ اس کے قدم پھر تیزی سے اٹھنے لگے۔ ایک دفعہ اسے یہ گمان بھی گزر تھا کہ پچھے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور کسی نے جھانک کر دیکھا ہے مگر اب وہ اس برآمدے میں بھکٹا ہے سو دبھر رہا تھا وہ بڑھا چلا گیا بلکہ اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ چلنے چلنے سے کچھ دوسروں ہوا اور آن کی آن میں ایک تصور سا بند ہو گیا۔ جیسے کوئی اسے ڈھونڈ رہا ہے اور وہ کمرے کے پچھتا پھر رہا ہے جسے تیری تلاش ہے وہ خود جسے ڈھونڈ رہا ہے گا۔ میری کس کو تلاش ہے؟ آخ رس کو؟ کیوں وہ کون ہے؟ میں کون ہوں؟ اور وہ شخص عبادت خانہ کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔ تب حضرت بائز یہ نے اندر سے پوچھا تو کون ہے اور کس کو پوچھتا ہے اور اس شخص نے جواب دیا کہ مجھے بائز یہ کی تلاش ہے اور حضرت بائز یہ نے پوچھا کون بائز یہ؟ وہ کہاں رہتا ہے اور کیا کام کرتا ہے؟ تب اس شخص نے زور سے دروازہ بھکٹا یا اور پکارا کہ میں بائز یہ کو ڈھونڈتا ہوں اور حضرت بائز یہ پکارے کہ میں بھی بائز یہ کو ڈھونڈتا ہوں مگر وہ مجھے نہیں وہ زینے کی چوکھت سے مخوا کھاتے کھاتے بھی پھر وہ سنبھالا اور تیزی سے زینے سے نجی اتر گیا۔ جب وہ سیزھیاں اتر رہا تھا تو اسے یوں لگا کہ اوپر سب کروں کے دروازے کھل گئے ہیں اور بہت سے لوگ برآمدے میں نکل آئے ہیں اور زور زور سے باتیں کر رہے ہیں۔ بہت پیچھے اٹھتا ہوا یہ ہم شور اس کے ذہن میں منتلا تی ہوئی ان کہانیوں میں گل نہ ہو گیا جن میں شہزادے نقشیں کہتا یا ہوا پھل توڑ کر جب واپس ہوتے تھے تو ان کے پیچے ایک شور اٹھتا تھا وہ مزکر دیکھتے تھے اور پتھر کے ہن جاتے تھے کہیں آدمی بھی پتھر بن سکتا ہے؟ اس نے بے سرو پا خیال کوفور اور کردیا۔

جب وہ باہر نکل کر سڑک پر آیا تو جیران رہ گیا۔ ہائی انتی رات ہو گئی اسے جیرانی یہ سوچ کر ہو رہی تھی کہ ابھی دن تھا جب وہ گھر سے مصباح الدین کی طرف چلا تھا۔ مصباح الدین سے وہ کھڑے کھڑے ملا اور سمجھ کے گھر کی طرف چل چڑا۔ سمجھ کے پاس بھی وہ ایسا کہاں ٹھہر اتھا۔ ڈھانی بات کر کے وہ فوراً ہوٹل کی طرف آگیا تھا۔ ہوٹل سے وہ ائے پیروں واپس ہوا اور باہر نکل آیا اور اپ باہر نکل کر یہ معلوم ہوا رہا ہے کہ جانے کتنے گھنٹے وہ اندر بھکٹا رہا ہے آخراتی دیر کہاں گئی اور کیسے گئی۔ میں راستے میں کہیں بھک تو نہیں

گیا تھا مگر کہاں؟ تو پھر اتنی رات کیسے ہو گئی؟ یا پھر یہ محض اپنا احساس ہے کہ اتنی رات بیت گئی ہے اس نے ایک مرتبہ پھر سڑک پر دور تک نظر ڈالی۔ ٹرینک کے کوئی آثار نہیں تھے دو تک سڑک سنان پڑی تھی اور روشنی کی یہ کیفیت تھی کہ گویا ادھر سے ادھر تک قدموں سے پروئی ہوئی ایک ڈوری تھی ہوئی ہے۔ سامنے بس ناپ تھا مگر خالی سائیبان میں اندر ہاتھا۔ اسے شک ہوا کہ اندر کوئی ہے مگر جب اس نے غور سے دیکھا تو یہ شک رفع ہو گیا اور اس نے قدم بڑھاتے ہوئے سوچا کہ بسوں کا وقت بیت گیا اب گھر تک پہل مارچ کرتا ہے۔

ایک خالی اندر ہیری بس برابر سے گزر چلی گئی۔ یہ بس تھی اسے تجھ ہوا کہ بس تو اس شور سے چلتی ہے کہ فراغوں دور سے اس کی آمد کا اعلان ہونے لگتا ہے مگر یہ بس اتنی چپ چاپ گزرنگی کہ جب تک برابر نہ آ گئی اس کا پتا ہی نہ چلا اس کے اندر ہیرے در پیچے اس کی آنکھوں میں پھر ہے تھے وہ سوچنے لگا کہ روشنی نہ ہو تو یہی دیکھی بھائی بس کتنی پر اسرار معلوم ہونے لگتی ہے۔

روشنی نہ ہو تو یہی دیکھی بھائی چیزیں کتنی پر اسرار بن جاتی ہیں۔ مگر اس نے دیکھا کہ چیزیں تو بھل کی روشنی میں بھی پر اسرار نظر آ رہی تھیں اول تو وہ اسی پر حیران تھا کہ جب اس نے سڑک پر قدم رکھا تھا تو سڑک کے سارے قسمی آپس میں پہنچتے نظر آ رہے تھے اور اب اس نے چلانا شروع کیا تھا تو کہبے اتنی دور دور نظر آ رہے کہ ایک کہبے سے دوسرے کہبے تک پہنچنے کے لئے اچھے خاصے اندر ہیرے سے گزرا پڑتا تھا اور کہبے سے کہبے تک کی مسافت میں اتنے نشیب و فراز آ رہے کہ آگے چلتی ہوئی پر چھائیں زیادہ سیاہ اور زیادہ قریب ہوئی جاتی پھر وہ تیزی سے چل کر برابر آ جاتی اور برابر چلے لگتی۔ پھر کہبے کی منزل پر پہنچ کر وہ چھڑا و بن جاتی اور جب پھر کہبے سے کہبے کی منزل کا سفر شروع ہوتا تو غائب پر چھائیں میں ظاہر ہو جاتی پھر دو کالی پر چھائیاں زاویہ حادہ بناتیں اور وہ دو پر چھائیوں کے درمیان گھرا ہوا کہبے کہبے گزرا چلا جاتا۔ یہ دوسری پر چھائیں کس کی ہے؟ اور اس اچاٹک حیرت کے ساتھ خوف کی ایک مہم رواں کے جسم میں تحریقی چلی گئی۔ اس کے اندر ایک لہر اٹھی کہ مژکر کردی کہبے مگر وہ فوراً اسی ٹھٹک گیا۔

تو میاں میں اکیلا چل پڑا۔ بارے بیچے ہوں گے۔ آدمی رات ادھر آدمی رات ادھر۔ سڑک بھائیں بھائیں کرے اور میرا جی اندر سے یوں یوں کرے۔ اس نے پانچوں انگلیوں کو جوڑ کر اشارہ کیا۔

اوچی جب میں اٹلی کے نیچے سے نکلا ہوں تو مجھے لگا کہ کوئی پیچھے آ رہا ہے۔ مژکر جو دیکھوں تو کوئی آدمی۔ نہیں پے۔

قسم اللہ پاک کی آدمی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا کہ بے بندو آج تو مار گیا پھر جی وہ مجھے سے آگے کل گیا اور لے لے ڈگ

بھرنے لگا۔ پھر وہ لمبا ہونے لگا اور لمبا ہوا اور لمبا ہوا۔ پھر جی وہ الی کے پیڑ کے برابر ہو گیا۔ بھیا میں نے دل تی دل میں قل پڑھنی شروع کر دی۔ بس جی تین دفعہ پڑھی تھی کہ سالا چھو ہو گیا تو میاں یو ہے قل کی برکت۔

سامنے سے زور شور سے آتی ہوئی کارنے اسے ہٹ بڑا دیا۔ گھری بھر کے لئے ساری سڑک جگل ہو گئی اور کار باران کے شور کے ساتھ فراٹے سے برابر سے گزرتی چلی گئی۔ کار کی یہ فراٹے کی رفتار اس کے مزاج کو کسی قدر بہت کر گئی۔ یوں انہا وہند کار چلانا کہاں کی شرافت ہے؟ کون تھا؟ یہ شخص وہ کوشش کے باوجود اس کی شکل و صورت کو تصور میں نہ لاسکا۔ وہ گزر ابھی تو سائے کی طرح تھا۔ پھر اسے یونہی خیال سا گزر اک کہیں وہ اسی لئے تو کارتیزینیں چلا رہا تھا کہ کوئی اسے شناخت نہ کر سکے۔

ہوٹل کے سامنے سے گزرتے گزرتے اس نے ایک نظر ہوٹل پر ڈالی۔ ہوٹل ابھی تک کھلا تھا، مگر لوگ آتے جاتے نظر نہیں آتے تھے۔ سائیکل شینڈ پر سائیکلوں کا جو تجویم وہ پہلے دیکھ کر گیا تھا اب غائب تھا۔ لے دے کر ایک سائیکل گھری تھی تو گویا ایک شخص ابھی موجود ہے اور اس خیال کے ساتھ کہی سوال بنتے چلے آئے۔ ایک سکڑ کے لئے ہوٹل کھلا ہوا ہے۔ وہ کون شخص ہے جو اتنی رات گئے تک ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہے؟ یہ ہوٹل رات بھر کھلا رہتا ہے؟ اس کے قدم ہوٹل کی طرف اٹھنے لگے مگر سائیکل شینڈ تک بیٹھنے پہنچنے اس نے ارادہ بدی دیا۔ رات بہت ہو گئی ہے گھر چلانا چاہیے اور وہ پلٹ پڑا۔

وہ پھر دو پر چھائیوں کے درمیان گھر اگھر اچلنے لگا۔ کیا ان پر چھائیوں کی قید سے رہائی ممکن نہیں ہے؟ اور اس نے سڑک سے بہت کر کھبوں کے پرے چلانا شروع کر دیا۔ میں اندر ہیرے میں چلوں گا اندر ہیرے میں آدمی سے سایہ جدا ہو جاتا ہے مگر مختلف سوت کے کھمبوبوں کی روشنی اب بھی اس حد تک پہنچ رہی تھی اور اس نے پر چھائیوں کی قید سے رہائی نہیں پائی تھی کیا یہ چھائیوں کی قید سے رہائی ممکن نہیں ہے؟ اور اس نے اس جسم کا تصور کیا جس کا سایہ نہیں تھا اور باطل مستقل سایہ کرتا تھا اور جس پر کمکی نہیں پہنچتی تھی۔ اس نے اس پر کچھ ایسا اثر کیا کہ دھفاتا سب و سو سے اور واہنے دھل گئے اور اس کے اندر ایک لطیف ہی کیفیت امنڈ نے لگی۔ اپنے قدموں کی چاپ کسی دوسرے عالم سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کسی اور راستے پر مزگایا تھا اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی ایک لرزتی کا نیتی آواز عجیب نفسگی کے ساتھ کافنوں میں گونج رہی تھی۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے

سفید بھا ایسا ململ کا کرتے اجل اجل اچھرہ ترکی ٹوپی دادا جان کی تسویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ جب صحیح کی نماز کے بعد وہ منا جات پڑھنی شروع کرتے تھے تو آنکھیں ان کی ڈبڈانے اور ہونٹ کا نپنے لگتے تھے اور رفتہ رفتہ وہ سفید داڑھی آنسوؤں میں تر ہو

جانی۔ اس تصور کے ساتھ اس کی طبیعت میں گداز پیدا ہو گیا۔ وہ رقت بھری آواز ایک وجہ کی کیفیت ہن کر اس کے دل و دماغ پر چھاگئی۔ اس کا بے ساختہ جی چاہا کہ وہ اسی انگھڑشیریں تنم کے ساتھ مناجات شروع کر دے۔

اے خاصہ خاصانِ رسول وقت دعا ہے سائے کی طرح ہم پا عجب وقت پڑا ہے

مگر وہ جھجک گیا کہ رات گئے پا آواز بلند مناجات پڑھنا کچھ مناسب نہیں۔ پھر اس نے یاد کرتا چاہا کہ اس زمانے میں کیا واقعہ گزارا تھا کہ دادا جان نے مناجات رقت کے ساتھ پڑھنا شروع کر دی تھی مگر اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ پھر اسے تھوڑا تھوڑا یاد آیا کہ وہ سرا مصروف وہ کسی اور طرح پڑھتے تھے کس طرح پڑھتے تھے یا اسے یاد نہیں آیا۔ حافظہ پر زور دینے کے اس عمل کے ساتھ اس کی وہ وجہ کی کیفیت رفتہ رفتہ بالکل رخصت ہو گئی۔ بس اب تو ایک دکھ بھرا حساس اس کے چکلیاں لے رہا تھا۔ وہ جسم جو پر چھا بیکس سے ماوراء قا اور اپنابدن جو بھنپ پر چھایاں ہے اور جس پر بھیوں کا بیسر اہے اور جس پر کوئی بادل سایہ نہیں کرتا ہم کس جسم کی پر چھا بیکس میں قافلہ جو گزر گیا اور پر چھا بیکس جو بھنپ رہی ہیں ہم کس گز رے قافلے کی بھنپ پر چھایاں ہیں میں بھنپتی پر چھایوں کے قافلے میں سے ایک بھنپتی پر چھا بیکس ہیں کس ہم کی مون ہوں؟ میں ہوں ہر چند کہ ہوں نہیں ہوں۔ اس مرد دامن خدمت نے کہا کہ اسے میرے عزیز سن تیرے پہنچنے غار ہے۔ غار میں آگ بھڑک رہی ہے۔ بھڑکتی آگ کے غار کے آگے ایک دیوار ہے۔ ایک دیوار بھڑکتی آگ کے غار کے آگے ہے۔ ایک دیوار اس سے بلند تیرے آگے ہے تو جو دیوار بھڑکتی آگ کے غار کے آگے ہے اس پر زنجیروں سے جکڑے ہوئے غلام چل رہے ہیں اور جو دیوار تیرے آگے ہے اس پر زنجیروں سے جکڑے ہوئے غلاموں کی پر چھایاں چل رہی ہیں اور اسے عزیز تو مذکور نہیں دیکھ سکتا۔ پس تو نہ بھڑکتی آگ کو دیکھ سکتا ہے نہ مقید غلاموں کو دیکھ سکتا ہے تو ساری عمر اس آگ کا عکس اور اس عکس میں رینگتی ہوئی پر چھایاں دیکھے گا۔ سامنے سے آتی ہوئی بس کو دیکھ کر وہ محبوں کے سامنے سامنے چلنے لگا بس جو ایک آنکھ سے اندر گئی تھی۔ جب اپنے ایک زرد ہند لے بلب کے ساتھ گزری تو اس نے دیکھا کہ اندر تو بالکل ہی اندر گمراحتا۔ اس کے گزر جانے پر اسے گمان گزرا کہ سب سے پہنچے کی سیٹ پر کھڑکی کے قریب کوئی بیٹھا تھا۔ سوچا کہ کتنے یکٹر ہو گا مگر کتنے یکٹر چھپ کر پہنچلی نشت پر کیوں بیٹھا تھا۔ چند لمحے وہ اسی اوہیزہ بن میں چلتا رہا کہ بس کی پہنچلی نشت پر کون بیٹھا تھا اور کیوں بیٹھا تھا؟ پھر اس نے جلدی ہی دل میں یہ مٹے کیا کہ بس بالکل خالی تھی۔ یہ بھنپ اس کا وہم ہے کہ پہنچلی نشت پر کوئی بیٹھا تھا۔ بھنپلہ پہنچلی نشت پر کتنے یکٹر کیوں بیٹھتا اور بس خالی ہو تو پھر کوئی پہنچلی نشت پر کیوں بیٹھنے لگا ہے؟ اس کے جی میں آئی مز کر دیکھے کہ بس کتنی دور تک گئی یا کہیں تھوڑی دور چل

کر کھڑی ہو گئی ہے۔ مگر وہ مرتے ٹھنک گیا وہ لبے لبے ڈگ بھرنے لگا۔

جب وہ اپنی کوئی میں داخل ہو رہا تھا تو اس کی پرچاہیں ایک ساتھ بھی ہو کر اس سے پہلے اندر داخل ہو گئی۔ ایک سماں اندر سے جانے کس طرف سے دم دبا کر تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ کتے کی پرچاہیں اس کی پرچاہیں کوتیزی سے کافی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

برآمدے میں قدم رکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ اماں جی جاگ تو نہیں رہی ہیں۔ اگر جاگ رہی ہیں تو پھر سوا لوں کا تاثابند ہے گا کہ کہاں تھے اب تک؟ کیا کر رہے تھے؟ کھانا کھالیا اور وہ اس احتیاط سے کہ قدموں کی آہٹ نہ ہو۔ آہٹ سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا ہو لے سے چھپی کھوئی اور چکپے سے اندر ٹک گیا۔

کمرے میں چیزیں دے جس طرح بھری چھوڑ کر گیا تھا اسی طرح بھری پڑی تھیں۔ سوائے ایک ناول کے کہ وہ الماری میں رکھ کر گیا تھا، مگر اب وہ میز پر کھلا ہوا لانا پڑا تھا۔ اسے کریدہ ہوئی کہ اس کے پیچے کتابوں کو کس نے ٹھوٹا تھا۔ وہ میز پر اٹھے پڑے ناول کو دیکھنے لگا پھر اسے شیسم کا خیال آیا جو دون میں ایک دفعہ ضرور کتابوں کو ٹھوٹی ہے اور کوئی نہ کوئی نہ کر لیتی ہے تو گویا آج پھر کتابوں کو اسٹ پلٹ کیا گیا ہے۔ پھر اس نے آٹش دان پر کھے آئینے کو دیکھا۔ وہ ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ اسے اپنی صورت تو اس میں نظر نہیں آئی البتہ کہیاں اس کی روشنی سطح پر پتھری دکھائی دیں۔ اس نے اس خیال سے کہ نئے آئینے کو کھیاں غلط کر کر سیا کر دیں گی۔ بڑھ کر آہٹ سے آئینے پوش ڈال دیا۔

وہ کپڑے بدلتے ہوئے بھجا کر لیت تو گیا مگر کوش کے باوجود اسے نہ نہ آئی۔ وہ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اندر ہرے میں آنکھیں کھولیں، بند کیں، یہاں سمجھ کر اس کی پلکیں دکھنے لگیں اور آنکھیں جلنے لگیں۔ پھر اس نے دھقی آنکھیں کھولیں تو اسے اندر ہرے میں اور تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ ہاں دروازے کے شیئے سفیدی کے دوڑے بڑے مددھوں کی صورت دکھائی دے رہے تھے۔ سفیدی کے ان مددھوں کو اس نے بار بار غور سے دیکھا کہ ان کے اس طرف کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اسے آپ ہی آپ پہنہ آئے لگا اور اس کا دم گھنٹے لگا آخراں نے انھی کرہتی جلا دی۔ کمرے کی فضائیں اس تبدیلی سے تھوڑی دیر کے لئے اسے کچھ سکون رہا۔ مگر پھر خفغان ہونے لگا اور بیکلی کی تیز روشنی میں دم گھنٹے لگا۔ بغیر کسی ارادے کے وہ بستر سے انھی کھڑا ہوا۔ کپڑے بدلتے ابال درست کئے گلچاہ کرتا ہوا آئینے کی طرف چلا پھر فوراً اس تکلف کو ملتوی کر بیکلی گلی اور کمرہ بند کر کے باہر ہو لیا۔ وہ باہر ہڑک پر اس طرح آیا جیسے قید خانے کو دیوار پھاند کر لکھا ہے۔ سڑک خالی اور خاموش تھی اور روشنی کی نالیاں آڑی آڑی بھی ہوئی دور تک دکھائی دے رہے تھے۔

رنی تھیں۔ اگلے کمبے سے پرے درخت کے نیچے جہاں کچھ کچھ اندر ہمرا تھا اس نے دیکھا کہ ایک کاشمیل بی بی لاٹھی تھا میں چھپ چاپ کھڑا ہے۔ اس نے اپنے قدموں کو ڈھیانا نہیں پڑنے دیا اور خود اعتمادی سے بڑھتا چلا گیا۔ کاشمیل اپنی بی بی لاٹھی تھا میں اس طرح بے حس و حرکت جیسے لکڑی کا بننا ہوا کھڑا رہا اور وہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف نظر اٹھائے بغیر بڑھتا چلا گیا۔ جب اس منزل سے وہ اطمینان گز رکیا تو اس نے دیکھا کہ پھر اس کے آگے بیچھے دو پر چھائیاں چل رہی ہیں۔ وہ سڑک سے ہٹ کر کچھ میں چلنے لگا۔ میں اندر ہرے میں چلوں گا کہ اندر ہرے میں آدمی سے سایہ جدا ہو جاتا ہے اور آدمی کو آدمی نہیں پہچاتا۔ جب وہ روشنی سے اندر ہرے میں آیا تو اس نے اطمینان کا ساس لیا کہ سایہ تو میرا ہم سایہ ہے پر جب وہ پل کے قریب پہنچا تو ایک درخت کے نیچے اندر ہرے میں کھڑی ہوئی بے جھی کاڑی کے نیچے سے ایک کتا لکھا اور بھوکلتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ تب اس نے دل میں کہا کہ میرا ہم سایہ میرا دشمن ہے اور وہ اندر ہرے کے دائرہ سے نکل کر روشنی کے پھر میں آگیا۔ کتا روشنی میں بھی اس کے بیچھے بھوکلتا چلا رہا۔ یہ دیکھ کر اس نے روشنی سے لبریز سڑک پر لبے لبے ڈگ بھرنے شروع کر دیئے پھر تو وہ کتا اور زور دو سے بھوکلنے لگا تب اس نے جھلا کر ایسٹ اٹھائی اور دنخارہ کر کھینچ کر کتے کو ماری۔ کت پلاٹ کر بھاگا اور اس نے کتنی قدم کتے کا تعاقب کیا اور جالے اور اندر ہرے کی اس سرحد تک گیا۔ جہاں سے کتا عبور کر کے اندر ہرے میں گم ہوا تھا۔

وہ سڑک پر اپنے رستے پر پڑا لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ اس وقت اس کے تصور میں آگ سے بھر کتے شعلے اگلے غار کی تصویر پھرا بھری اور اسے ایسا لگا کہ پاپرے نجیب غلام کتے کا تعاقب کرتا بیچھے رہ گیا ہے اور وہ اس کی پر چھائیں آگے نکل آیا ہے۔



بُدیوں کا ذہان

ایک سال شہر میں سخت قحط پڑا اور علاں و حرام کی تیزی اٹھ گئی پہلے چل کوئے کم ہوئے پھر کتے بیان تجویز ہونے لگیں۔ کہتے ہیں کہ قحط پڑنے سے پہلے یہاں ایک شخص مرکب جی اٹھا تھا وہ شخص جو مرکب جی اٹھا تھا۔ اس کے تصور میں سما گیا۔ اس نے اس تصور کو فراموش کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ تصور کسی صورت فرماؤش نہ ہوا۔ بُدیوں کا ذہان خیج وہ ندیدی آنکھوں والی بھوکی سوکھی عورت بار بار نظروں میں پھر جاتی، اس قصے کی ایک ایک تفصیل اس کے ذہن میں ابھر نے لگتی۔ وہ شخص جو مرکب جی اٹھا تھا۔ جب مر اتواس کی بالیں پکوئی نہ بیٹھا تھے یا سکن پڑھی گئی نہ گریہ و زاری ہوئی، نہ کسی نے آنکھ بند کی جب لوگ صحیح ہونے پر وہاں آئے تو دیکھا کہ جو شخص رات مر گیا تھا اور وہ انھ کر بینچ گیا ہے۔ اس منظر پر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دہشت آتی گر پھر وہ اس دوبارہ زندگی پر سرور ہوئے اور پھر درودور سے دیکھنے آئے کہ کیا وہ شخص جو مر گیا تھا خیج جی اٹھا ہے۔

وہ شخص جو مرکب جی اٹھا تھا بھوکا تھا۔ اس نے کھانا مانگا۔ مرکب جی اٹھنے کے بعد یہ پہلی خواہش تھی، جب سامنے کھانا آیا تو وہ اس طرح لونا جیسے صدیوں سے بھوکا چلا آتا ہے۔ کھاتے کھاتے اسے پسند آگیا اور دستخوان خالی ہو گیا۔ شام کو اس نے اس سے بھی زیادہ کھایا اور دوسرا دن اسے پچھلے دن سے بھی زیادہ بھوک گئی پھر وہ ہر وقت بھوکار ہے لگا۔

وہ شخص جو مرکب جی اٹھا تھا ہر صورت بھوکا دکھائی دیتا۔ ہر گھر سے روئی آتی اور حصتی روئی آتی اسے وہ چٹ کر جاتا۔ کھانے کو اس طرح جتنا جیسے صدیوں کا بھوکا ہے اور سارے شہر کی غذ اچاٹ جائے گا۔ نوالہ اس طرح توڑتا جیسے درندے شکار پھاڑتے ہیں اسے اس بری طرح کھاتے دیکھ کر دیکھنے والوں کے دلوں میں نامعلوم سی دہشت پیدا ہوتی اور وہ بھی بھی تو گچکی کر آنکھیں بند کر لیتے۔

گھروں میں یہ ہوا کہ کھاتے کھاتے کھانا کم پڑ جاتا اور جب بی بی سے پوچھا جاتا تو وہ کہتی کہ کھانا اس شخص کے لئے بھی تو لکھا ہے جو مرکب جی اٹھا تھا۔ پھر اس شخص کا حساس رکھ کر گھروں میں کھانا زیادہ پکنے لگا۔ مگر کھانا پھر بھی کم پڑ جاتا اور پوچھنے پر بی بی جواب دیتی

کہ کھانا اس شخص کے لئے بھی تو نکالیے جو مرکر جی اٹھا تھا تو لوگ دستخوان سے بھوک کے اٹھنے لگے اور رزق کی کی کا احساس ہونے لگا۔ انہیں مگان ہونے لگا کہ گھر جو روٹی کپتی ہے اس میں سے وہ شخص جو مرکر جی اٹھا ہے زیادہ حصہ بیلتا ہے اس مگان نے یہ اثر دکھایا کہ ہر شخص بھوکا بھوکا دکھائی دیتے لگا اور رزق کی کمی کا خیال داہم گیر ہو گیا۔

وہ شخص جو مرکر جی اٹھا تھا سے بھوک ہی کی خواہش بہت تھی۔ کسی سے بہت بولنا نہ ملتا جلنا نہ غصہ کرنا نہ غم کھانا دکھ سکھ سے بے نیاز، محبت و نفرت سے نا آشنا تو جس روز اس شخص نے جو اسے کھانا بھینچنے پر بہت کڑھنے لگا تھا اسے کھانا نہ بھیجا تو اسے نہ تو غصہ آیا نہ غم کھایا۔ پاں وہ خاموش گھر سے کلک کھڑا ہوا۔ مرکر جی اٹھنے کے بعد یہ پہلا دن تھا کہ وہ گھر سے لکھا تھا۔ گلی کے کلڑ پر ایک کتا اسے دیکھ کر آہستہ آہستہ غرایا گر جب اس نے کتے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو کتنے اپنی دم تاگوں میں سمیٹ لی اور پاں سے بھاگ گیا۔

وہ شخص جس نے آج اس شخص کو جو مرکر جی اٹھا تھا کھانا نہیں بھیجا تھا دستک ہونے پر باہر آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ شخص جو مرکر جی اٹھا تھا اس کے دروازے پر کھڑا ہے۔ یہ دیکھ کر اس پر اُنکی میت طاری ہوئی کہ گھر میں جو کچھ پکا پکایا تھا وہ اسے اٹھا لیا اور اس شخص کے حوالے کر کے اسے رخصت کیا۔

وہ شخص جو مرکر جی اٹھا تھا اس روز سے باہر نکلنے لگا۔ جب وہ باہر نکلتا تو اس کے روکے سوکے بدن میں رنگتی ہوئی سالہا سال کی بھوک اس کی آنکھوں میں کھینچ آتی۔ ہر کھانے کی چیز کو وہ اُسی مریل اور ندیدی نظر وہ سے دیکھتا کہ چیز والے کا چیز سے جی پھر جاتا۔ وہ گرم توروں کے پاس سے گزرتا اور روٹیوں کی بھی خوشبو اس ندیدے پے پن سے سوچتا کہ تازہ پکی ہوئی روٹیوں کی مہک اڑ جاتی اور ڈاکٹر زائل ہو جاتا۔ وہ طوائیوں کی دکانوں کے برابر سے گزرتا اور اس ندیدے پے پن سے دیکھتا کہ رنگ بر گلی مٹھائیوں کے رنگ پلیے پڑ جاتے اور مٹھاس غائب ہو جاتی۔ وہ پھلوں کی دکانوں کے قریب سے نکلتا اور اس ندیدے پے پن سے نظر ڈالتا کہ پھلوں کا روپ اتر جاتا اور تازگی جاتی رہتی۔ یوں کھانے پینے کی چیزوں کے رنگ، مہک اور ڈاکٹے غائب ہونے لگے۔ چیزیں کھانے میں کبھی بے مزہ لگتیں کبھی مزدود لا ہوا معلوم ہوتا۔ پیسٹ اٹ جایا گر بھوک جوں کی توں قاءِ رحمتی پس لوگوں کے من کا ذا اکٹ بگڑتا چلا گیا اور بھوک بڑھتی چلی گئی زیادہ کھاتے اور جتنا کھاتے اتنے ہی بے مزہ ہوتے۔

وہ شخص جو مرکر جی اٹھا تھا ایک روز بازار سے گزرتا تھا کہ ایک کتے سے جو بڑے انہاک سے گوشت سے بھری ایک ہڈی کو پچھوڑ رہا تھا۔ مذکور ہو گئی کتے نے پہلے تو دانت بکالے اور غرایا لیکن اس شخص نے جو مرکر جی اٹھا تھا جب خونخوار نظر وہ سے اسے دیکھا تو وہ

دم دا کروہاں سے بھاگ گیا اگر چہ دور کی لگی میں جا کر دیر تک بھوکتا رہا۔

اس واقعہ سے لوگوں کی طبیعت ایسی منفی ہوئی کہ انہیں کھانے پینے کی چیزوں میں نجاست کا احساس رہنے لگا۔ یہ نجاست کا احساس ان کے دل و دماغ میں اس طرح سایا کہ وہ ہر چیز کو اس بھوکی ندیدی نظر سے بھاکر رکھنے کی کوشش کرتے پس جب وہ شخص جو مر کر جی اٹھا تھا۔ بازار کی طرف چلتا تو حلوائی اپنی مشائی کی تھا لوں پر خوان ڈھانپ دیتے اور ناتانی آپنے تھوڑوں کے آگے پر دے گرائیتے۔ اس احتیاط کے بعد بھی انہیں احساس رہتا کہ مریل ندیدی نظر میں پر دے کو چھیرتی ہوئی روٹیوں مشائیوں اور پھلوں میں پیوست ہو رہی ہیں اور خوشبو اور ذائقہ کھینچتا چلا جا رہا ہے اور نجاست سراہیت کر رہی ہے۔ اس احساس نے یہ اڑ کیا کہ لوگ اس شخص سے جومر کر جی اٹھا تھا یہ ار رہنے لگے وہ اس سے بیزار بھی تھے اور اسے رواج کے مطابق روٹیاں بھی بھیجتے تھے۔ صبح و شام خاموشی سے اسے بندگی ہوئی مقدار میں روٹیاں بھیجتے اور دل ہی دل میں کڑھنے مگر کسی کو محال نہ تھی کہ روٹیاں بھیجنے سے ہاتھ روکے کہ انہیں معلوم تھا کہ اس صورت میں وہ شخص جومر کر جی اٹھا ہے سوتا ہوا آئے گا اور ان کے دروازے پر دستک دے گا۔

ایک روز ایک عامل کا گزر راس شہر میں ہوا۔ وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ اس نے اس شخص کو جومر کر جی اٹھا تھا دیکھا اور بھرے بازار میں عصائیک کر کھڑے ہو گیا۔ اس عامل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور نعمہ مارا بتا تو کون ہے؟ پھر تکمیر کا نعرہ بلند کیا اور وہ شخص جومر کر جی اٹھا تھا یہ نعرہ من کر لکھ دیا اور جی مار کر گر پڑا۔ سبھے ہوئے لوگوں نے جب ڈرتے ڈرتے اسے قریب جا کر دیکھا تو یہ دیکھ کر اور سہم گئے کہ وہ شخص جومر کر جی اٹھا تھا مارا پڑا ہے اور اس عامل نے ان لوگوں سے خطاب کیا کہ-----

”اے لوگو خدا تم پر رحم کرے تم مر نے والوں کو اکیلا چھوڑ دیتے ہو۔ تمہارے شہر میں ایک شخص سر اور تم اس کی بالیں پنهنہ بیٹھے اور ایک بدروں نے آ کر اس میں بسیرا کر لیا۔ خدا تمہارے شہر پر رحم کرے۔“

ایسی بر سر اس شہر میں قحط پڑا۔ دیکھتے دیکھتے اس شہر میں جمل کو عہدا ہن گئے اور کتنے قحط زد دلوں کو دیکھ کر دم دبا کر بھاگنے لگے۔ وہ شخص جومر کر جی اٹھا تھا جس کے تصور میں سما گیا تھا۔ اس نے اسے بھلانے کی بہت کوشش کی اس واقعہ کو تو وہ اسی رات جب یہ سنایا گیا رد کچا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے بہت ملازمت میں کہ جس بات کو اس کی عقل نہیں مانتی اس پر آخر دہ کیوں بار بار دھیان دیتا ہے۔ مگر وہ شخص جومر کر جی اٹھا تھا اس کے تصور میں روپ بدلت کر آیا اسے جانے جانے کب کب کی باتیں یاد آئیں اور کس کس طرف دھیان گیا اسے اس لپے تر گئے سانے کا خیال آیا جو کہیں بچپن میں کالے آم کے باغ کے پاس ملا تھا۔ اس یہاں تک سنان دوپہری میں وہ اچانک جانے کس طرف سے سامنے آ گیا؟ کالا بھنگ بڑی بڑی سفید آنکھیں سر پر بڑا سا گلہ بہر لکھ

ہوئے لبے لبے بال، کاتوں میں بڑے بڑے بالے وہ قریب سے گزتا چلا گیا اور جب وہ گزر گیا تو تھوڑی دیر بعد ایک لڑکے نے مژ کردیکھایا راس نے حیرت سے کہا۔

وہ آدمی کہاں گیا؟

ان سب نے ایک دم مڑکر دیکھا۔ پچھلے نہیں سنا ان پڑی تھی۔ ان کے منہ پر ہوا نیاں اٹنے لگیں پھر کسی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ کون تھا وہ؟ اور سب ایک دوسرے کامنہ سکھنے لگے۔ پھر ایک یہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے وہ بالکل نہیں ڈراہے کہنے لگا۔
یا رکوئی بھی نہیں سانسیا تھا۔

سانسیا تھا؟

ہاں سانسیا تھا۔

تونے اس کے پیدا کیتے تھے؟

نہیں۔

استاد اس کے پیدا کی طرف تھے۔

پیدا کی طرف؟ سب نے یک زبان پوچھا۔

ضم اللہ کی پھر اس کی آواز یا کیک دھی پڑ گئی۔ اس نے سرگوشی والے لہجہ میں کہا۔ یہ بڑے بڑے پیدا تلو آگے تھا اور پاؤں

پیچھے۔

سب دم بخود رہ گئے، ان کی آنکھیں بھیلی پلی گئیں، یہاں سمجھ کر وہ سمت کر صرف آنکھیں رہ گئیں، بڑی بڑی آنکھیں جو ایک دوسرے کو تک رہی تھیں، پھر انہوں نے بھلی کی حیزی سے اپنے اپنے پیداوں کی جو تیار، کھڑا دوں اور چل اتارے اور بھاگ کھڑے ہوئے وہ جو بھی خالص اور محض آنکھیں تھے اب خالص اور محض ناانکھیں تھے۔ اور اب اسے اس حادثت پر فتنی آری تھی، پیچھوں میں بھی آدمی کیا کیا احتمانہ بات سوچتا ہے جنگل میں چلتا ہوا ہر آدمی اسے جن نظر آ جاتا ہے۔ اس جنگل میں جو شہر سے ایسا دوڑنیں تھا۔ سناں دو پہر یوں میں کوئی بڑا سا بندرا چانک درخت سے زمین پر کوڈ پڑتا تو لگتا کہ آدمی اور جتنا اس بندر سے جو آدمی معلوم ہوتا تھا ذرگتا اس سے زیادہ آدمی کو دیکھ کر خوف آتا کہ کیا خبر ہے وہ آدمی نہ ہو۔ مگر اس نے سوچا، سانے تو شہر میں پہنچ کر بھی اتنے ہی ذردار نے نظر آتے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ کس طرح وہ مودار ہوا کرتے تھے۔ اچانک کسی دن آبادی سے ذرا پرے اس سڑک پر جس پر لا اریاں چلا کرتی

تھیں۔ کنارے کنارے دو تک تلیں گاڑیاں کھڑی دکھائی دیتیں، تلیں کھلے ہوئے گاڑیوں کے ساتھ میں چادریں اور چیخھرے توڑ رے تھے ہوئے اور بیہاں سے وہاں تک دھواں اور دھوکیں اور دھوپ میں لپٹا ہوا کوئے پیشے کا شور جیسے کسی پرانے قبیلے نے آ کر شہر کی تاریخی بندی کر لیے ہے بال کافیوں میں بڑے بڑے بالے کامی بیجنگ صورتیں ان ہڈیوں لگائے ہوئے سونتے ہوئے چہروں میں ڈالی سفید آنکھیں کہ باہر اب نکلیں اور اب نکلیں۔ لوپے کی موئی موئی سرخ انگارہ ایسی سلاخیں اور ان پر ہتھوڑوں کی پڑتی ہوئی مسلسل چوٹیں پیشہ میں ڈوبے ہوئے ان لپے ہاتھوں میں تھاما ہوا ہتھوڑی ایک رفتار سے ضربیں لگاتار ہتا ہیاں تک کہ انگارہ ایسا لواہ خام کھانے لگتا۔ دونوں ہنتوں وہ گاڑیوں کے سائے میں بننے ہوئے خیسے اسی طرح پڑے رہتے اور دھوکیں دھوپ اور پینے میں سنا ہوا کوئے پیشے کا شور انتہا ہتا۔ پھر کسی دن اچانک وہ خیسے غائب ہو جائے بس، بہت سے ٹوٹے ہوئے چوپے مردہ را کھکھی ڈھیریاں اور کچھ سوکھا کچھ گیا لوگ پر پڑا رہ جاتا۔

یار سانیے چلے گئے۔ ان لڑکوں کو جتنا ان سانیوں کے اچانک آ جانے پر تجوہ ہوتا تھا ان کے اچانک چلے جانے پر تجوہ ہوتا۔ جنگل کی طرف روای دواں ٹوبی کے قدم چلتے چلتے رک جاتے۔ انہیں لگتا گویا جنوں کا ایک قائد تھا کہ آیا تھہرا اور گزر گیا۔ اجرے چاہیوں اور ٹھنڈی بھیٹیوں کو وہ حیرت سے مبتکنے لگتے۔

یار یہ سانیے بہت گندے ہوتے ہیں۔ چھپکلی بھی کھا جاتے ہیں۔

چھپکلی ابے وہ تو سانپ سک کھا جاتے ہیں۔

سانپ-----نہیں یار۔

متانوں!

مگر یار سانپ کوئی کیسے کھا سکتا ہے۔

ضم اللہ کی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ یہاں سانپ سانیے نے اسے تکھے تکھے کر دیا پھر اسے کڑھائی میں وہ منہ بگاڑ کر چپ ہو گیا۔

اس یاد نے اس پر کچھ بہت ہی ناخوشگوار اثر کیا کہ طبیعت ٹھیک جانے لگی۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ آدمی کیا الابا اپنے پیٹ میں بھر تار ہتا ہے۔ چھپکلی مینڈک سانپ، چھپو ہر جیز تو آدمی بھی پھر جٹھی ہی ہوانا؟ یہ پیٹ آخر ہے کیا بلا؟ اس کے حافظے نے پھر چیخھے زندگانی۔

اے اماں جی دیکھو اے روئیوں کی تھی کی تھی صاف کر دی۔

پینا بس کر زیادہ نہیں کھاتے ہیں۔

اماں جی آج اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ اس کے پیٹ میں تو جن بیٹھا ہے۔ تو جن بہت کھاتے ہیں؟ اور اس سوال کے ساتھ اس شخص کا خیال آگیا جس کے آگے سے جن روئیاں اٹھائے گیا تھا اور اس کے بعد وہ سوکھتا چلا گیا۔ اور اس شخص سے اس کا دھیان بھکا تو ایک اور شخص کی طرف چلا گیا۔

پی بی مردے کو ساتھ کھاتے دیکھنا اچھا نہیں؟ اماں جی ڈرے ڈرے لہجے میں بولیں:

”مولوی صاحب نے یہ خواب سناتو چپ ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ صدقہ دو۔ ڈوبے نے صدقہ تو بہت دیا، پر ہوئی تو ہو کر رہتی ہے۔ ساری جائیداد او جزو ہو گئی۔ بس اسی غم میں دماغِ الٹ گیا۔ قبرستانوں میں مارا مارا پھر تھا اور دیکھنے میں بڑیوں کا ڈھانچہ گیا تھا۔ اس یہ سمجھ لوکہ غریب جیتے جی مرگیا۔“

وہ شخص جو جیتے جی مرگیا تھا اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ پسکیلیج ایسا آدمی آنکھوں میں حلکے پڑے ہوئے جس مدیلے بال با تھے میں تو یہ لپٹی ہوئی روئیاں لپک قبرستان والی مسجد کی طرف جانا، پھر کسی کو وہاں نہ پا کر آپ ہی آپ ہی جیران ہوتا اور پھر جیران گلی گلی پھرنا۔ اس شخص نے جو جیتے مرگیا تھا اس مسجد کے پاس ایک فقیر کو خڑے دیکھا تھا کہ صد لاکھ تھا بابا میں بھوکا۔ اور اس شخص نے اس بھکاری سے کہا کہ باہتمام یہاں نہ ہو۔ میں تمہارے لئے کھانے کو لاوں گا۔ پھر وہ بہاں سے بہت تیزی سے چلا اور روٹی کے لئے میں جمع کرتا پھر۔ اس نے تین دن تک کوڑی کوڑی جمع کی اور جب تیرسرے دن رونٹی خرید کر وہ بہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر جیران رہ گیا کہ وہ فقیر تو وہاں ہے ہی نہیں۔ کہاں گیا وہ؟ پہلے اسے تجب ہوا۔ پھر وہ جیران و پریشان اسے گلی گلی ڈھونڈتا رہا۔ جب اس کا کہیں کھونج نہ ملا تو پھر اسی مقام پر آیا جہاں سے چلا تھا اور فقیر کی تلاش میں قبرستان والی مسجد بھک جانا، پھر مانگنے والے کو وہاں نہ پا کر شہر میں ڈھونڈتے پھرنا اور پھر واپس آ کر قبروں میں نکل جتا۔ اور وہ شخص جس کے اندر بدروں میں تھیں جبیں کے پار قبروں اور پہاڑوں میں چلا تا اور اپنے تیس پتھروں سے زخمی کرتا پھر تھا۔ وہ شخص کشتی سے اترنے والے کو قبروں سے نکل کر ملا اور بڑی آواز سے چلایا کہ قسم تجھے رب کی مجھے عذاب میں نہ وال اور جب بدروں میں کے اندر سے نکل گئیں تو لوگ اسے دیکھنے آئے۔ لوگ اسے کپڑے پہنے اور ہوش میں بیٹھے دیکھ کر ڈر گئے۔ یہ کب کا قصہ اسے یاد آ گیا وہ چونکہ پڑا۔ کب کے قصے اس کے ذہن میں آ رہے

ہیں اسے تجھ ہونے لگا کہ وھیان کا سلسلہ کہاں پہنچا ہے اور کتنی انہل یادوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ وھیان کا سلسلہ بھی کتنا ہے سلسلہ ہوتا ہے اور اسے اپنے وھیان سے ڈر آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس وقت باہر چل کر جی اور سا گیا جائے کہ وھیان بنے اور دل بدل۔

وہ گلی گلی گزرتا گیا۔ پھر دفاترِ حکم گیا۔ یہ دلبے لبے ڈگ بھرتا ہوا کدھر جا رہا ہے؟ قبرستان کی طرف؟ اور یہ مسجد کون سی ہے کیا۔ فقیر وہی تو مگر پھر فوراً اسے اپنی بے وھیانی کا احساس ہوا۔ یہ راستہ قبرستان کی طرف نہیں مال روڈ کی طرف جاتا ہے۔ یہ مسجد جہاں بھی ہو اس کے سامنے میں کھڑا ہوا فقیر ایک ہی طرح کا لگتا ہے۔ سامنے ایک ہوٹ دیکھ کر اس کے قدمے ارادہ اس طرف الحج گئے۔ اس نے سوچا کہ تھوڑی دیر پیش کرستا ڈا اور چائے پیو۔ تباہ تباہ پھر نے سے جو وھیان آوارہ ہوتا ہے اس سے بھی نجات مل جائے گی۔

ملکی سفید اڑھی چہرے پر جھریاں کمر ڈرا جبکی ہوئی پدن پر ڈھیل میل اپنکن وہ شخص کھانے پر منڈھا ہوا تھا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر بے تحاشا کھانے جا رہا تھا۔ اسے یوں بے طرح کھاتے دیکھ کر بہت بیز ار ہوا کہ عجب شخص ہے قحط زدؤں کی طرح کھانے پر نوتا پڑا۔ اسے کتنے دن سے روٹی نہیں ملی تھی؟ بے تحاشا کھانے والے شخص نے کھانا ختم ہونے پر جلدی جلدی انگلی سے پلیٹ کو صاف کیا پھر پانچوں انگلوں کو ہوتوں سے صاف کیا اور اس سے فارغ ہوا ایگ احتیاط سے رکھی ہوئی پینگ کی بدھی اٹھائی اور اطمینان سے چھوڑتا شروع کردیا پہلے تودہ بے تحاشا کھانے والے شخص کو تجھ بے گلکنی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ندیدے پن کو دیکھ کر اس کی طبیعت ماش کرنے لگی۔ اس نے اس طرف سے نظریں پھیہ تو لیں لیکن کبھی ہوتوں کی چپ چپ پر کبھی بڑی چیزوں نے کی آواز پر نظر خواہ نہ ہوا اس طرف اٹھ جاتی۔ اس نے ایک بار بہت حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ یہ آدمی ہے یا بلا۔ پھر اس حقارت کی کیفیت پر کچھ ٹھک اور حیرت کی ملی جلی کیفیت غالب آگئی۔ کیا خبر ہے وہ آدمی نہ ہو۔ اس نے بہت غور سے اس کا سرے ہٹک جائزہ لیا۔ کیا وہ زندہ ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اسکا وھیان بھکنے لگا تھا مگر پھر اسے فوراً ہی خیال آ گیا کہ یہ تو پھر وہی اوہاں میں الجھنا ہوا۔ اس نے وہ میزی ہتھی بدل دی اور دوسروی میز پر اس کی طرف پیچے کر کے جا بیٹھا کر نہ اس پر نظر جائے گی نہ وھیان بنے گا۔ اس نے یہرے سے مختلف میزوں پر بکھرے ہوئے اخبار میگئے انہیں اکٹھا کیا اور یکسوئی سے پڑھنا شروع کر دیا۔

اخبار پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ ہوٹل میں شور کچھ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس نے اخبار سے نظریں اٹھائیں۔ اردو گروکی ساری میزوں گھر گئی تھیں اور یہرے لپک جھپک میز میز گھومنے پھرتے تھے۔ اس کی نظر سامنے بھی ہوئی گھڑی پر پڑ گئی تو گویا لیٹ کا

وقت ہو گیا ہے۔ دروازہ بار بار کھلا اور ہر بار اونچی آوازوں میں باقی کرتے ہوئے کلکوں کی کوئی نئی نوئی اندر آ جاتی اور مزید ایک میر گھر جاتی۔ اپا نک پچھے خیال آ جانے پر اس نے مزکر دیکھا۔ گیا وہ شخص؟ اچھا! اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ دیکھتے دیکھتے ہوٹل اتنا بھر گیا کہ بعد آنے والے کوئی میر خالی نہ پا کر رواپس ہو گئے۔ ہر میز پر پلٹیوں اور چچوں کا ایک بے عکم شور تھا اور لوگ جلدی جلدی کھا رہے تھے بلکہ سٹک رہے تھے۔ اس نے ایک ایک میر کوہر میر کے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا، کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو آدمی ہیں یا بائیگیں اور رفتہ رفتہ اسے یوں لگا کہ مختلف چہرے لبے ہوتے جا رہے ہیں اور جہڑے پھیل رہے ہیں۔ اس کے تصور میں پھر کچھ پر چھائیاں منڈلانے لگی تھیں۔ مگر اس نے جلدی سے جھر جھری لی اور اتنی زور سے ہیرے کو آوازوی کہ آس پاس کے میزوں والوں نے چونک کر اسے دیکھا وہ خود بھی اپنی اس حرکت پر اتنا پیٹھا گیا تھا کہ ہیرے کے آنے پر ایک لخت کھانے کا آرڈر دے ڈالا حالانکہ اس وقت اس نے صرف ایک پلیٹ شامی اور چائے پر گزارہ کرنے کا تھی کیا تھا آرڈر دینے کے بعد اس کی نظر نہ ادا نہ پھر اردو گردی میزوں پر گئی۔ مگر اب اس کا موؤبدلا ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کھانے والوں کو ہمدردی سے دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مجھ کے لئے لے دے کے ایک گھنٹہ تو ملتا ہے۔ اس وقت میں کھایا یا کیا جا سکتا ہے۔ بس پیٹ کی دوسری کوہر لیجئے۔

اس نے بے دھیانی میں کھانا شروع کیا اور کھاتا چلا گیا۔ وہ اتنے بڑے بڑے لفے اس تیزی سے منہ میں لے جا رہا تھا کہ ایک دفعہ اس کے طبق میں پہندا لگا اور اسے یوں لگا کہ اس نے پانی نہ یا تو اس کی آنکھیں نکل پریس گی۔ پانی پیتے ہوئے اسے خیال آیا کہ میں اس بے تحاشا پن سے کیوں کھا رہا ہوں اور پھر اسے ایک نرالا خیال آیا یہ میں ہی ہوں؟ وہ شخص جو اس وقت اس میز پر کھانا کھا رہا ہے وہ میں ہی ہوں؟ اس نے احتیاط سے نوالہ توڑا۔ اسی احتیاط سے اسے منہ میں رکھا اور اس بے لطاقی سے منہ چلانا شروع کیا۔ بیٹھنے سے الگ کوئی مشین ہے جس کے پہنڈل کو وہ گھما رہا ہے۔ اس وقت وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کاش کھانے والے کے پورے کے سفر کا مطالعہ کر سکتے پھر اس نے سوچا کہ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھانا کھانے والے کو چھوڑ کر بے تحاش کھانے والے شخص کی میز پر جائیشوں اور وہاں سے دیکھوں کہ یہاں جو شخص کھانا کھا رہا ہے وہ کون ہے؟ کیا میں میں ہی ہوں؟ کاش ہم جان سکتے ہیم اگر ہیں تو کیا وہ ہمی ہیں اور کاش ہمیں اپنی ذات کے ملک کو بدر جو ہوں سے نجات دلانے کے لئے روح اللہ کی ضرورت ہوا کرتی اور وہ شخص جو مرکری ٹھنا تھا اس کے تصور میں پھر منڈلانے لگا مگر اب وہ اس فٹک میں پڑ گیا تھا کہ آیا وہ شخص جو مرکری ٹھنا تھا، اس کے تصور میں سایا ہوا ہے یا وہ اس کے شخص کے تصور میں سایا ہوا جو مرکری ٹھنا تھا۔

اس نے جس تیزی سے کھانا شروع کیا تھا اسی آہنگی سے کھا رہا تھا۔ اپا نک اس کی ساری بھوک مرگی تھی۔ بھوک کیا رہتی

اس پر تواب یہ دوست سوارتی کہ وہ خوبی بھی اس بے تحاشا کھانے والے شخص سے مختلف نہیں ہے۔ پھر وہ اس سوق میں پڑ گیا کہ وہ کھا کیا رہا ہے۔ اسے ان مختلف ہوٹ والوں کی خبریں یاد آئیں جو غیر حالل گوشت پکانے کے الزام میں پڑے گئے تھے۔ اس خیال نے ایسا اثر کیا کہ پھر اس کے من میں تو لاہی نہیں چلا۔

جب وہ با تحدِ روم سے ہاتھ و ہونکر باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ ہوٹ کم و پیش خالی ہو چکا ہے۔ اکا دکا میز پر کوئی کوئی کسٹر کسی قدر آسودگی کے احساس کے ساتھ بیٹھا چاہئے پی رہا ہے۔ میرے غائب غله ہیں۔ صرف ایک ہیرا بڑے اطمینان و فراخخت کے ساتھ صافی سے میز سی صاف کرتا پھرتا ہے۔ الگ ایک گوشے میں خاموشی سے چائے پیتے ہوئے ایک شخص کو دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ یہ اسے تو نہیں تھک رہا تھا۔ لیکن اسے اپنا یہ گمان خود ہی احتمانہ نظر آنے لگا۔ مجھے کیوں دیکھتا ہے۔ میرے کیا سینگ لگے ہوئے ہیں پھر اسے میرے کو زور سے آواز دینے پر چونک کر دیکھا تھا۔ اس نے اڑتی نظر اس شخص پر ڈالی اور مطمئن ہو گیا نہیں یہ شخص نہیں ہے۔ ویسے اس خیال کے بعد اسے بکلی سی ضرور ہونے لگی۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ ہوٹ آخرب کب تک میتھے رہو گے۔ کسی قدر بجلات سے مل ادا کر کے وہ باہر نکل گیا۔

سامنے بس سٹاپ پر ابھی ایک بس آ کر رکی تھی۔ اس نے دوڑا گاہی اور سٹاپ پر جلدی سے پہنچ کر جوہم کے ساتھ اندر گھس گیا اور پہچلی سیٹ پر سب سے الگ جایا تھا مگر اگلے سٹاپ پر مسافر اتنے سوار ہوئے کہ پہچلی نشیں سب بھر گئیں اور وہ جو سب سے الگ بیٹھا تھا جوہم کا حصہ بن گیا۔ برابر میں ایک شخص کا منہ برابر چلے چارہ تھا۔ وہ پتے پہنچکیاں پہنچکیاں لگا رہا تھا۔ اس کے منہ سے آتی ہوئی چنوں کی خوشبو سے اس کی طبیعت مکدر ہونے لگی۔ اس جلدی جلدی سچلتے ہوئے منہ کو دیکھ کر اسے بے تحاشا کھانے والے شخص کا خیال آگیا مگر اب وہ ایسے خیالات سے بالکل بور ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ سوچتا بھی کتنا تھا کہ دینے والا مشغله ہے۔ کوئی خیال بالا بن کر چھٹ جاتا ہے۔ دماغ کے اندر جا گھستا ہے۔ پھر بلا سے بلا پیدا ہوتی ہے اور بلا داؤ کا جوہم ہو جاتا ہے اور اس خیال سے اسے ایک اور خیال آیا۔ بدرجواح آدمی کے اندر سا کہاں ٹھکانہ کرتی ہے؟ پیٹ میں؟ یا دماغ میں؟ دماغ؟ دماغ خود ہی تو بدرجواح نہیں کہ آدمی کے اندر سا گیا ہے؟ اس بدرجواح سے نجات ممکن ہے؟ اور اس نے اس خیال سے شہ پا کرایے آدمی کا تصور باندھنے کی کوشش کی جس کا دماغ نہیں ہے۔ اس کے تصور نے کئی بے ذہنی ٹھکیں بنائیں اور بگاڑ دیں اور فرض کیجئے کہ آدمی کا سر سی رہی نہیں؟ یہ خیال پسلے تو اسے بہت عجیب سا لگا لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک صورت میں ڈھلتا گیا۔ سرے محروم ایک ما درزا و برہنہ شخص اس ما درزا و برہنہ شخص نے اپنا سر ہتھی پکار کر رکھا تھا اور سمجھ کی سیزھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ گراس تصور سے وہ فوراً بول سا گیا۔ جس تیزی سے تصور اس کے ذہن میں ابھری تھی۔ اسی تیزی سے اس نے اسے رد کر دیا۔ جوہم کی وجہ سے اس کا دم رکنے لگا تھا گھری بھر کے لئے اس نے جوہم سے قطع نظر

کر کے کھڑکی کے باہر سرکال کر دیکھا۔ یوں کچھ تباہ ہو والی اور سانس میں سانس آیا۔ سوچنا بھی اچھا خاصا ایک ڈراؤن اعلیٰ ہے اس نے سوچا اور اگلے پچھلے سارے خیالات کو دماغ سے رفع کرنے کی کوشش کی اور اب واقعی وہ کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ ہاں بہت سی بے جوڑ یادوں، خیالوں اور تصویروں کے بکھرے شیرازے سے دماغ کے اندر ایک دھندسی اٹ گئی تھی۔ یہ دھند دیر تک یوں اپنی روی میسے وہ جگنی ہے۔ مگر پھر رفتہ رفتہ چھدری پڑنے لگی اور کچھ مٹی مٹی سی قد آور پر چھائیاں تصویر میں ابھر نے لگیں، وہ شخص جو مر کر جیتا تھا، وہ شخص جو مر کر بھی نہ مرا مادرزاد بہن سرکتا شخص، تصویر کو پھر شمل گئی تھی مگر وہ خیالوں سے ڈرگیا تھا اس زندگی سے کل جھاگا تھا اس زندگی سے کل جھاگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی سے سرکالا۔ یہ بس آخر کب تک چلتی رہے گی۔ فلک بس کا ڈینس ابھی دور تھا۔ مگر اسے ایسا تھفہ ان ہوا کر اگلے ہی شاپ پر اتر گیا۔

اب شام ہو چلی تھی شور مچاتے ہوئے سرایہ کو دے رختوں پر بیٹھتے اور بغیر کسی وجہ کے بھرا کھا کر فضا میں بکھر جاتے تھے۔ اب ایلوں کا ایک جھرمٹ اڑتے اڑتے اتنی بلندی پر پہنچ گیا تھا کہ اب تھبہ اہوا کھائی دیتا تھا۔ سڑک کے گز پر الہیمنان سے بیٹھے ہوئے کتے نے آہٹ سن کر سر اٹھایا۔ اسے گھور کر دیکھا اور بہت آہستہ آہستہ غرانے لگا۔ گھورتے غراتے کتے کا سرسی خیال آیا اور ساتھ ہی یاد آیا کہ آج تو جھرات ہے اور اب وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا وہ کتنا کالا تھا۔ قدم بٹکھے، دو پلٹ پڑا پلٹ پڑنے کی کوئی ایسی لمبیں تھیں۔ بس اسے یہ خیال آگیا تھا کہ اب رات ہوتی ہے۔ شہر کیاں جاؤ گے کھدا اپس چل چلو البتہ سڑک کے گز کو عبور کرتے ہوئے اس نے آس پاس کا احتیاط سے جائزہ لیا اور سامنے سڑک پر دو تک لگاہ دوڑا آئی۔ وہ بہت حیران ہوا کہ اتنی سی دیر میں وہ کتنا کہاں چھو ہو گیا۔ اسے اب یاد آ رہا تھا کہ وہ کتنا تو کالا تھا اور یہ جھرات کی شام ہے تو یہ نہیں کوئی بدر دوح تو نہیں تھی؟ وہ دیر تک اس تک میں گرفتار رہا کہ آیا وہ کتنا تھا یا کتنا نہیں تھا اور جب گلی میں مڑا اور اس ناچائی کی دکان سے گزر جس نے پکتی ہوتی ہڈیا سے ایک بھی ڈھکن اٹھایا تھا تو اس کی سوندھی سوندھی بھاپ کے ساتھ اسے خیال آیا کہ اس نے دوپہر کا کھانا برائے نام کھایا تھا۔ اسے یہاں کیک بھوک لگ گی آئی اور اس کے قدم جلدی جلدی گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ مگر اسی کے ساتھ اسے غائب ہو جانے والے کتے کا پھر خیال آ گیا۔ وہ کتنا تھا یا کتنا نہیں تھا؟ پھر اسکی گھوڑتی غرائی صورت اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ وہ کتنا مجھے دیکھ کر عجیب طرح سے غرایا تھا۔ وہ کتنا کتنا نہیں تھا یا میں ----- اور وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ میں کون ہوں؟ کیا میں ہی ہوں؟ اسے ٹھٹھا ٹھٹھا اپسینا نے لگا۔ پھر اسے لگا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور ان ٹکیں بی بی ہو گئیں ہیں۔ بے تحاشا بھوک لگ آئی ہے۔



ہم سفر

یہ اسے دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ قاطل بس میں سوار ہو گیا ہے۔ اس کے آگے کی آشست پر بیٹھا ہوا دبلا پتلا لڑکا جو ایک چھوٹے سے سوت کیس کے ساتھ اسی سٹاپ سے سوار ہوا تھا۔ لگبڑا یا لگبڑا یا لگبڑا تھا۔ لڑکے نے آگے پیچھے مختلف مسافروں کو لگبڑا تی نظر میں سے دیکھا یہ مودوں ناؤں جائے گی۔

ہاں تمہیں کہاں جانا ہے؟

مودوں ناؤں جی بلک----- وہاں جائے گی۔

”جائے گی۔“ برابر میں بیٹھنے ہوئے لگبڑی سر، لٹک صورت او جیز عمر شخص نے بے احتناقی سے جواب دیا۔ اور یہیک درست کرتے ہوئے پھر ان خبر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

یہ بس مودوں ناؤں والی ہے؟ اچھا؟ اس میں کیوں بیٹھ گیا۔ کچھ عجلت میں کچھ اندر ہرے کی وجہ سے اس نے بس کے نمبر پر دھیان نہیں دیا تھا۔ دور سے دیکھا کہ بس کھڑی ہے۔ دوڑ لگادی بس کے قریب پہنچا تو کند کیلدر روازہ بند کر کے سینی بھجا چکا تھا۔ اندر ہادھند چلتی بس کا دروازہ کھلا اور اچک کر فرشت بورڈ پر لٹک گیا۔ پھر بڑی جدوجہد سے راست پیدا کر کے اندر پہنچا۔ اگلے سٹاپ پر ایک مسافر اتر ا تو چھٹ اس کی آشست سن چالا لی اور اب پتہ چلا کہ قاطل بس میں سوار ہوئے۔ خیر سات پیسے ہی کی توبات ہے۔ اگلے سٹاپ پر اتر جاؤں گا۔ ویسے اگلے سٹاپ پر اترنے اور پھر وہاں کھڑے ہو کر بس کا انتظار کیتھیں کے خیال سے اسے تھوڑی کوفت ضرور ہوئی بس کا انتظار کیتھیں کا اسے بہت تلخ تجربہ تھا جب بھی سٹاپ پر آ کر کھڑا ہوا سیکی ہوا کہ جانے کس کس راستے کی بس آئی اور گزر گئی نہ آئی تو ایک اس کی بس نہ آئی۔ عجب بات یہ ہوئی تھی کہ جب گھر سے شہر آنے کے لئے کھڑا ہوتا تھا تو سامنے والے سٹاپ پر شہر سے گھر کی طرف آنے والی بس تھوڑے تھوڑے تھوڑے تھوڑے آ کر کھڑی ہوتی اور گزر جاتی پر شہر جانے والی بس دیر تک نہ آتی۔ جب شہر سے گھر آنے کے لئے سٹاپ پر پہنچتا تو گھر کی سمت سے آنے والی بس بار بار سامنے والے سٹاپ پر آ کر کھڑی ہوتی اور گزر جاتی۔ گھر کی سمت سے آنے

والی بسوں کا ایک تاتا بندھ جاتا۔ ادھر اس کا سٹاپ دیر ان رہتا اور بس کا دور دور نشان نظر نہ آتا۔ ہاں ایسا کافر ہوا کہ ابھی وہ سٹاپ سے دور ہے کہ اس کی بس فرائی کے ساتھ براہر سے گزری۔ سٹاپ پر کھڑی ہوئی اور اس کے پہنچنے پہنچنے چل کھڑی ہوئی اور پھر وہی دیر تک کھڑے رہتا، کھڑے کھڑے بور ہو جانا اور ٹھیلنے لگ جانا۔ آج فوراً کے فوراً بس مل گئی تو وہ جی میں بہت خوش ہوا تھا مگر اب پہ چلا کہ یہ تو غلط بس ہے۔

اگلا سٹاپ آنے پر وہ ایک کٹکش میں گرفتار ہو گیا کہ اترے یا نا اترے۔ اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ تو سڑک ہی دوسروی ہے۔ یہاں اسے اپنے روٹ والی بس کہاں ملے گی۔ بس بیکی ہو سکتا ہے کہ پیدل مارچ کرتا ہو اواپس پہنچنے سٹاپ پر جائے اور وہاں کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرے۔ اٹھا پھر انہ کریم پہنچ گیا۔ مگر میں آگے بھی کیوں جا رہا ہوں۔ یہ تو میں اپنے راستے سے اور دور کل جاؤں گا۔ اس نے پھر اترنے کی ہمیں باندھی مگر اٹھنے کو ہلا تھا کہ بس چل پڑی۔ وہ اٹھنے اٹھنے پہنچ گیا۔ بس کی رفتار بھلی سے تیز ہوئی گئی اور وہ اس خیال سے پریشان ہونے لگا کہ وہ اپنے راستے سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ غلط بس مجھے کہاں لے جائے گی۔ اسے خالد کا خیال آیا جو موڈل ناؤن میں رہا کرتا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو اس وقت کوئی خدشہ نہیں تھا۔ رات ہرے سے اس کے گھر بر ہوتی۔ خالد نیم پھر شریف کالیا اسے پھر ہی ہوئی تکڑی یاد آنے لگی۔ خالد سب سے آخر میں گیا۔ نیم پتھر اور شریف کالیا پر وہ ہمیندوں خارکھا تارہ تھا کہ ڈوڑیاں کبھی قدر ہے اچھی نہیں آئی اور دوتوں وظیفے پر امریکہ پیٹھے ہیں۔ یار نہ مل سکا راش پتھر سے سے پیٹھل جائیں تو بس انہوں نکل جاؤں۔ بہت خراب ہونے لئے یہاں میں کہتا ہوں کہ کچھ نہ ہو گا۔ ہمیں میں پلیٹ صاف کر لیا کریں گے۔ یہاں سے تو نہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خالد یہاں سے نکل جانے پر کیوں تلاہ ہوا ہے مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ خالد نے شیک ہی کیا یہاں تو بس میں سفر کرنا بھی ایک قیامت ہے۔ بس میں رش بے پناہ تھا اور کھڑکی سے قریب تو تھی سوار یا تھیں کہ لوگ ڈر اڑ راسی جگد کے لئے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے کھوئے سے کھو جھلتا ہوا پسینے میں شرایور، الباسوں سے خیر کی طرح اٹھتی ہوئی خوبصورت شخص نے یکسوئی سے اخبار پڑھنے کی تھانی تھی۔ مگر پھر اخبار بند کر کے اس سے پٹکھا جعلنا شروع کر دیا دبالتا لڑکا اسی طرح گھر یا گھر را یا تھا۔ ہر سٹاپ پر پوچھ لیتا یہ موڈل ناؤن ہے؟ اور نبی میں جواب پا کر تھوڑی دیر کے لئے اطمینان سے بیٹھ جاتا مگر اگلا سٹاپ آتے آتے اخtrap پھر بڑھنے لگتا۔ اس کے اپنے برابر بیٹھا ہوا میلے کپڑوں والا شخص جو دیر سے اونکھو رہا تھا بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ اسے سوتا دیکھ کر اسے کسی قدر تعجب ہوا کہ اس شور و غل اور دھماکہ کڑی میں وہ کس آرام سے سورہا ہے۔

بس کی رفتار اب تیز ہو گئی کچھ تیز ہو گئی تھی کچھ تیز گی۔ کئی سٹاپ آئے اور گزر گئے۔ کیا یہاں کوئی سواری لینے کے لئے نہیں

تحتی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو اگلے ستاپ پر سمجھے کے نیچے روشنی میں ایک خلقت کھڑی نظر آئی جیسے بے گھر بے در لوگوں کا کوئی کیمپ ہوا وہ سب کی نظر میں بس کی طرف گی ہوئی تھیں۔

یہ مودل ٹاؤن ہے؟

نہیں، شدّغ شخص نے دلے لالے کے سوال کا پھر اسی بے تعلقی سے جواب دیا۔ اس پھر پہل پڑی۔ اس کندگی کی طرح عجب ہے ادھر آتا ہی

نہیں۔ اس نے چاہا کہ کنڈیکٹر کو آواز کے کم توجہ کرے۔ مگر پھر سوچا کہ یہ تو کنڈیکٹر کا فرض ہے کہ وہ خود آ کر نکٹ کاٹے۔ کنڈیکٹر مسافروں کے ہجوم میں گھوتا رہا۔ پھر اس کے برابر سے ہوتا ہوا موتوروں کی نشتوں کی طرف نکل گیا اور ان کے درمیان دیر تک نکٹ کاٹا رہا۔ بھرے بھرے بچائے والی لڑکی جس کی قصیضی پیچے تک کسی ہوئی تھی اب اس کی نظری کزوں نہیں تھیں کہ دبلے لڑکے سے آگے کی نشست پر اسے جگہل گئی تھی۔ کھڑی ہوئی لڑکی اگر نظری کزوں نہیں ہوتے اسے نشست میں جاتا اسے کبھی نہیں بھایا۔ اب صرف اس کی اجیلی گردان سے نظر آ رہی تھی مگر دبلاز کا بار بار پریشان ہو کر اور ادھر دیکھتا اور اس کا زاویہ بگاڑھتا۔ اسے اس پر بہت غصہ آیا مگر پھر کنڈیکٹر کو فریٹ آتا دیکھ کر وہ دبلے لڑکے اور بھرے بھرے بچائے والی لڑکی دلوں کو تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا۔ اسے یونہی ایک خیال سا آیا کہ اگر وہ چاہے تو سات پیسے آسانی سے بچا سکتا ہے۔ کنڈیکٹر کی چار آنکھیں تو نہیں ہیں جو اس نے دیکھا ہو کہ وہ کس سٹاپ سے سورا ہوا تھا۔ پھر اس نے فوراً تھی اپنے آپ پر ملامت کی کہ سات پیسے کے لئے کیا بے ایمانی کرتا ہے۔ بہت ذیل حرکت ہے۔ مگر تھوڑی دیر بعد یہ خیال پھر اس کے اندر تقویت پکلنے لگا یہ سات پیسے بچا ہی کیوں نہ لئے جائیں۔ وہ دو دلا ہو گیا لائق اور مراجحت نے اس کے اندر ایک اخلاقی آدیش کی صورت اختیار کر لی۔ سات پیسے فتح جائیں اسے اپنی بے روزگاری کا خیال آیا پھر جیب پر نظر کی پھر سوچا کہ سات پیسے تو بہت کام آ سکتے ہیں لیکن پھر ایک مختلف روآئی نہیں میں میں بے ایمانی نہیں کروں گا بے ایمانی روح کو گہنا دیتی ہے اور جب وہ اس بڑے اخلاقی بحران سے گزر رہا تھا تو کنڈیکٹر اس کے سر پر آ کھڑا ہوا اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پہلے ساڑھے چار آنے پکڑے پھر اندر ہی انہیں تھوڑی کروروپیٹکا لانا اور کنڈیکٹر کو تھادیا۔

مودل ٹاؤن؟

ہاں۔

کنڈیکٹر نے تمیں آنے کا نکٹ کا نا اور باقی پیسے اسے تمہارے ہاتھ کا اور باقی پیسے کو کسی قدر بچکھاتے ہوئے لایا۔ یہ تو پوچھا ہی نہیں کر سکتے کہاں سے ہوا اور اس نے آس پاس کے مسافروں پر چور نظر ڈالی۔ سونے والے تصریح کو دیکھ کر اطمینان کا سائنس لیا اور پیسے اور نکٹ جیب میں رکھ لئے۔

سونے والے شخص کا سر پھر اس کے کامنے پر آن لٹا کھا اور اسے پھر اس شخص سے الجھن ہونے لگی تھوڑے یہی اب اسے زیادہ غصہ دبلے لڑکے پر آ رہا تھا جو اسی طرح سٹاپ آتے ہی بے چین ہو جاتا اور جب نکٹ اسے پہنچ جاتا وہ سٹاپ مودل ٹاؤن کا نہیں ہے۔ اسے چین نہ آتا۔

صاحب آج داتا در بار میں بہت خلقت تھی۔ اس کے قریب کھڑا ہوا ایک چہرے بدن میں اچکن والا شخص، شخص سے مخاطب تھا اور یہن کرائے یاد آیا کہ آج جمرات ہے اور اس آخری بس میں اتنا رش ہونے کی وجہ سے سمجھ میں آئی تو یہ لوگ داتا در بار سے آ رہے ہیں؟

میں نہیں جاسکا، شخص نے شرمندگی کے لمحے میں کہا۔ ایسے چکر رہتے ہیں کہ پاندھی سے نہیں جاسکتا کبھی کبھی مہینے کی پہلی جمرات کو چلا جاتا ہوں۔

مہینے کی پہلی جمرات کی تو سن لو۔ میں اچکن والے نے فوراً گلزار لگایا۔ آندھی آئے، مہینے کی پہلی جمرات کبھی قضاۓ بیس ہوئی۔ رکا اور پھر بولا۔ خان صاحب پچھلے مہینے عجب و اقدھ ہوا، اس سے سمجھ لو کہ رات بھر اس کی آواز ویسی ہوتی چلی گئی، صاحب ایک ملی یہ بڑی کالی بیجگ، آنکھیں انگڑا میں سہم گیا وہ جمرے کے پیچھے چلی گئی۔ خیر مگر تھوڑی دیر بعد پھر آگئی میرا دل دھک سے رہ گیا لوگوں کی ٹانگوں میں سے نکلتی ہوئی پھر جمرے کے پیچھے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لوگی وہ پھر آگئی۔ میں دل میں کہوں یہ کیا ماجرا غور سے جو دیکھتا تو صاحب وہ تو جمرے کا طواف کر رہی تھی مجھے چھسے سانپ سو گلے گیا۔ اسے نکلے جاؤں وہ طوائف کئے جائے۔ اسی میں ترکا ہو گیا اذان ہوئی میں نے ایک دم سے جھر جھری لی اب جو دیکھوں تو میں غائب۔

رجی! شخص نے چوک کر کھا۔
جی میں غائب۔

آس پاس کھڑے بیٹھے مسافر میں اچکن والے کامنہ مکنے لگے۔ شخص نے آنکھیں بند کر لیں۔
بات یہ ہے میں اچکن والا آہستہ سے بولا۔

جمرات کو جناتا حاضری دینے آتے ہیں۔

خاموش مسافروں کی آنکھوں میں جیرانی کچھ اور بڑھ گئی۔ ایک لمبی موچھوں والے چوڑے چکے شخص نے مختندا سانس بھرا بڑی بات ہے داتا صاحب کی اور اس کا سر بچک گیا۔

میں نہیں مانتا، کونے کی نشت سے ایک آواز آئی اور سب کی نظریں ایک دم سے سوت پہنچے ہوئے ایک شخص پر جم گئیں۔
آپ داتا صاحب کو نہیں مانتے؟ چوڑے چکے شخص نے برہمی سے اپنی بھاری آواز میں سوال کیا۔
داتا صاحب کو مانتا ہوں گر۔۔۔۔۔

مگر؟

مگر یہ کہ۔۔۔

مگر اور ہم نہیں مانتے ہم نے سیدھا پوچھا ہے کہ داتا صاحب کو مانتے ہو یا داتا صاحب کو نہیں مانتے۔

بھئی یعنی روشنی کے لوگ ہیں۔ خلاف عقل باتوں کو نہیں مانتے۔ شفیعؑ نے مصالحت آمیر انداز میں اس بات شروع کی۔ پھر سونے والے شخص سے مخاطب ہوا۔ مگر مسٹر ایمی آپ نے کہا کہ آپ داتا صاحب کو مانتے ہیں؟
ہاں انہیں مانتا ہوں۔ بزرگ شخصیت تھے۔

اگر آپ انہیں بزرگ شخصیت مانتے میں تو یہ بھی نہیں گے کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تو مسٹر آپ ان کی کتاب پڑھ لیں۔ اس میں خود انہوں نے ایسے مشاہدات لکھ رہے ہیں۔ شفیعؑ نے بولتے بولتے آس پاس کے مسافروں پر ایک نظر ڈالی اور اس کا استدلالی الجھ میں کریمیانہ لجھ بن گیا۔

داتا صاحب کو ایک سفر درجنہ ہوا۔ آپ منزل منزل جاتے تھے۔ ایک مقام سے گزر ہوا تو کیا دیکھا کہ ایک پہاڑ میں آگ گئی ہوئی ہے اور اس میں نوشاد رہتا ہے اور اس کے اندر ایک چوہا۔۔۔ وہ چوہا اس آگ کے پہاڑ کے پہاڑ کے اندر دوڑتا پھرتا تھا اور زندہ تھا۔ پھر وہ بے تاب ہو کر آگ سے نکل آیا اور نکلتے ہی مر گیا وہ چپ ہو گیا پھر بولا۔
اب اس کو کیا کہیں گے۔ عقل تو اسے نہیں مانتی۔

ج فرمایا داتا صاحب نے ایک داڑھی والے شخص نے خندنا سائنس لیا۔ پھر اس کی آواز میں رفت پیدا ہو گئی۔ ج فرمایا داتا صاحب نے آدمی بہت حقیر گھوق ہے۔ اور یہ دنیا۔۔۔ آگ کی لپیٹ میں آیا ہوا پہاڑ۔ بے ٹک بے ٹک۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کیا سن اپ نہیں آئے؟ اس نے سارے قصے سے پریشان ہو کر سوچا پھر فوراً خیال آیا کہ آج بھی گیا تو پھر؟ تو غلط بس میں سوار ہے اور اس وقت اسے یاد آیا کہ اس نے موڈل ناؤن کا گلکٹ خریدا ہے، یعنی میں موڈل ناؤن جا رہا ہوں مگر کیوں؟! بس ایک شور کے ساتھ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اس کے انجر بخہر چلنے سے کچھ اس طرح کھڑبردار ہے تھے کہ اسے دھشت ہونے لگی۔ اس نے مسافروں پر نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ وہ مسافر جو ابھی قدم قدم جگد کے لئے جھگڑ رہے تھے خاموش ہیں، ان کے چہروں پر ہوا نیاں اڑ رہی ہیں۔ اس کی دو پہچلی بیزاری اس وقت ہمدردی کے جذبہ میں بدلتی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کھڑا ہو کر ان سے کہے کہ دوستو ہم غلط

بس میں سوار ہو گئے ہیں مگر اسے فوراً ہی خیال آیا کہ وہ یہ کہے تو کتنا بے وقت بنا یا جائے گا۔ غلط بس میں تو وہ سوار ہوا ہے باقی سب سوار یاں صحیح سوار ہو گئیں ہیں۔ تو ایک ہی بس بیک وقت صحیح بھی ہوتی ہے غلط بھی ہوتی ہے؟ ایک ہی بس غلط راستے پر بھی چلتی ہے اور صحیح راستے پر بھی چلتی ہے؟ یہ صورت حال اسے عجیب لگی اور اس نے اس کے ذہن میں اچھے خاصے ایک مابعد الطبعیاتی سوال کی کل اغتیار کر لی پھر اس نے اس صحیح کو یوں سمجھایا کہ بس کوئی غلط نہیں ہوتی۔ بسون کے تواریخ اور سناب اور تمیس مقرر ہیں۔ سب بسیں اپنے اپنے راستوں پر رواں دواں ہیں غلط اور صحیح مسافر ہوتے ہیں اور سونے والے شخص کے سر کے بوجھ سے اس کا کاندھا نہیں لگتا مگر اس مرتبہ اس نے ہمدردانہ اس پر نظر ڈالی اور جنک کے ساتھ سوچا کہ سونے والا ہمسفر آرام میں ہے ہمسفر؟ اسے فوراً یاد آیا کہ وہ تو غلط بس میں ہے اور اس کے ساتھ والا لاجھ بس میں ہے پھر وہ دونوں ہمسفر کہاں ہوئے اس نے بس کے سارے مسافروں پر نظر دوز اگئی۔ تو میرا کوئی ہمسفر نہیں ہے؟

وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک سکھی کے قریب کچھ اندر ہیرے کچھ اجائے میں ایک خالی بس آگے سے پچھی ہوئی آدمی سڑک پر آؤ گئی کچھ میں۔ ایک خالی بے چتا تاگلے جس کے بھوں کا رخ آسان کی طرف تھا شاید کوئی حادثہ ہوا ہے پھر اس نے گردان اسی طرح باہر کالے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا۔ بس کے عقب سے کالا کالا دھواں بے تھاشا کل رہا تھا اگر بس میں آگ لگ گئی ہو؟ مگر آگ تو گلی ہوئی ہے اور اس خیال کے ساتھ اس کی نظر اس کھڑکی پر پڑ گئی جس کے اوپر لکھا تھا۔

صرف ہنگامی حالت میں کھولنے اس نے اندر بس میں اوہرے سے ادھر تک نظر دوز اگئی اور سہم گیا۔ بدر گنگ بلیوں کی روشنی میں وہ سارے چہرے زرد بلندی سے پڑ گئے تھے۔ ایک سے ایک بھرا ہوا لیکن خاموش جیسے جنکل کے اندر ہیرے میں گھرے ہوئے مویشی سست کر ایک دوسرے سے من بھرا کر چپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ داڑھی والے شخص کی آنکھیں بند ہیں لفڑھن نشست چپکا ہوا ساکت بیٹھا تھا چڑوا چکلا شخص ڈنڈے کو منبوطي سے مٹھی میں تھا کے کسی سوچ میں گم تھا۔ بنیل اچکن والے رخ بدال لیا تھا۔ اب وہ دوسرے لوگوں سے مخاطب تھا اور سونے والا شخص؟ سونے والا شخص اس کے دکھتے ہوئے کاندھے کا مستقل بوجھا باب وہ خڑائے لے رہا تھا۔ اس نے اس بے تعاقی سے اس سر کے نیچے دبے ہوئے باز کو دیکھا جیسے وہ اس کے جسم سے الگ کوئی چیز ہے۔ بیہاں صرف سونے والا شخص آرام میں ہے۔

یہ کون سا نیا پہ ہے لوگوں کو بے تھاشا ترتے دیکھ کر اس نے سوچا۔ لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے اس بد جوابی سے اترنے لگے جیسے کسی بڑی آگ سے بھاگتے ہیں یہ تو پوری بس ہی خالی ہوتی جا رہی ہے۔ اترنے والوں کے بعد کچھ لوگ سوار بھی ہوئے مگر

چل پڑنے کے بعد بس خالی خالی نظر آئی۔ اسے تجب ہونے لگا کہ ایک شاپ پر کتنے لوگ اتر گئے اور اگلے شاپ پر باقی لوگ بھی اتر گئے تو؟ تو وہ اکیلا رہ جائے گا۔ اس خیال سے وہ کچھ ڈر سا گیا۔ اس نے اطمینان کے لئے ان چہروں کو نٹلا جنہیں وہ شروع سفر سے دیکھتا آ رہا تھا میں وہ اس کے برسوں کے جانے والے ہوں سوت والے شخص کو تو اس نے خود اترتے دیکھا تھا ہیلی اچکن والا موجود تھا۔ اب وہ سیٹ پر بلاشکت غیر سے پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ شقِ شخص نے اخبار پھر کھول لیا اور اطمینان سے پڑھنا شروع کر دیا اور دیبا لڑکا! وہ کہاں گیا؟ اتر گیا؟ حد ہو گئی۔ عجیب بدحواس لڑکا تھا کہ موزل ناٹکون آنے سے پہلے ہی اتر گیا۔ اسے ندامت ہونے لگی کہ اس گھبراہٹ سے وہ بیادوچا بھجن محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ اسے سمجھا دیتا کہ موزل ناٹک تھی دو رہے اور کون سی سڑک گزر جانے کے بعد آئے گا تو شاید وہ چوک نہ کرتا مگر یہ ندامت کا احساس بہت جلد ہی رخصت ہو گیا۔ اس کی نظر اگلی سیٹ پر گئی جہاں بھرے بھرے پچھائے والی لڑکی بیٹھی تھی اس کی اجلی گرد صاف نظر آ رہی تھی اور اس کے درمیان کھوڑی ہوئی دیوار ہٹ پھیل تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

روکروکوڈا یک شخص ہڑبردا کر انھے کھڑا ہوا۔

بایو صاحب پہلے کیا سور ہے تھے۔ اب اگلے شاپ پر رکے گئی اور کندیکش سب سے اگلی سیٹ پر جایا۔ ہڑبردا کر انھے کھڑا ہونے والا شخص فوراً نیچے گیا۔ ایکاں کی وجہ اضطراب جس نے اسے بھونچاں کی طرح آ لیا اور ایکاں کی یہ ماں یوپی کہ وہ آئے کی طرح ہیچھے گیا۔ اس شخص کا اچنک اضطراب اور اچانک مایوسی دنوں ہی اسے عجیب لگے اور جانے کیوں اسے پھر وہ بیان لڑکا یاد آ گیا جو موزل ناٹک آنے سے پہلے ہی اتر گیا تھا وہ جو اپنے شاپ سے پہلے اتر گیا اور وہ خود جو غلط بس میں سوار گیا اور وہ جسے بس میں پاؤں لکانے لگی جگہ نسل سکی جو بس میں چڑھا اور چڑھ کر اتر گیا۔ بسوں میں سفر کرنے والے کسی نہ کسی طور پر خراب ہوتے ہیں مگر میں کہاں جا رہا ہوں اسے یہاں کیک خیال آ کر بس میں توب موزل ناٹک ہوتا تھا۔ اس کے قریب پہنچ پھیل ہے اور وہ اک ذرا ای اکساہٹ کی وجہ سے کہاں سے کہاں نکل آیا۔ اس رات گئے موزل ناٹک جا کر واپس ہوتا تھا مصیبت ہے اسے پھر خالدہ یاد آنے لگا۔ وہ بیہاں ہوتا تو آج کتنی آسانی رہتی۔ خالد اور نجم پتھر اور شریف کا لیا ان کی صحبت میں رہ رہتے ہے۔ وہ راتیں دن تھیں کہ گھروں سے دور وہ انسی کے خیال سے بے نیاز گلیوں اور بازاروں کو کھوندتے پھرتے۔ وہ گلڑی کتنی جلدی بکھر گئی جانے والے کہاں کہاں گئے اور اس کے لئے رات اپ پہاڑ ہے کہ اس راستے سے ذرا بھٹک جانا قیامت نظر آتا ہے۔ چودھری تھی یہ مارت کیا بن رہی ہے۔ میلی اچکن والے نے گھر کی سے باہر دیکھتے ہوئے چوڑے چکے شخص سے سوال کیا۔

صاحب اس راستے پر بہت بڑی عمارت ہن گئی ہے شفیع کہنے لگا۔ پہلے یہ ساری جگہ خالی پڑی تھی۔

”خان صاحب جی پاکستان سے پہلے تم نے نہیں دیکھا۔ چوڑا چکلا خنس بولا یہ سب جنگل تھادن میں قافلے لئے تھے۔ مگر ایک مرتبہ یاں دو انگریز شکار کھیلنے آئے۔ بہت دیر تک گولی چلاتے رہے۔ جانور بیچ کر نکل جاتے۔ دلوٹنے کھڑے تھے۔ انہوں نے بچھڑا کران سے بندوقیں لیں اور مخائیں مخائیں دو فیر کئے اور دو ہرن گرا لئے۔ پھر انہیں کیا سمجھی کہ جوانی کی ترنگ میں بندوقوں کی نالیں انگریزوں کی طرف کر دیں اگر یہ سرپر پاؤں رکھ کر بھاگے۔“

بھئی کمال ہوا میلی اچکن والے نے دادا کے لہجہ میں کہا۔

کمال نہیں ہوا حضرت جی چوڑا چکلا خنس درود بھرے لہجہ میں بولا۔

وہ انگریز بڑے صاحب تھے۔ دوسرا دن فرگنی پلشن آگئی بہت جنگل کو کھوندا پر وہ لوٹنے نہیں ملے۔ انہوں نے غصہ میں آ کر جنگل میں آگ لگا دی۔ تین دن تک جنگل چلتا رہا جو اندر رہا جل گیا جو باہر کلا گولی سے بھن گیا۔ بہت بھنا جنگل تھا۔ بہت بہت پرانا درخت کھڑا تھا۔ سب جل کیا میلی اچکن والے نے مخفی اس انس بھرا ہرے درختوں کا جانا اچھا نہیں ہوتا۔ تو اچھا نہیں ہوا بہت دنوں یہ جگہ اجاز پڑی رہی دن میں آتے ڈرگتا تھا۔

تم نے دیکھی ہے؟ میلی اچکن والے سوال کیا۔

نہیں۔

میں نے دیکھی ہے۔ انہی ماں کے خصم انگریزوں نے اس شہر کو بھی بہت پھونکا حضرت اولیاء صاحب کی درگاہ ہے۔ اس کے آس پاس بہت سنان ہے رات کو کتنی اکیلا اس راستے سے گزری نہیں سکتا۔ مگر بھائی صاحب ہم۔ جی وہ جنلبیں صاحب گئے۔ اس نے سوت والے شخص کی خالی نشست پر نظرڈالی۔ صاحب انگریزی پڑھ کے ہربات میں ایک مگر لگاتے کامرش بڑھ جاتا ہے۔ وہ تو اس میں بھی مگر لگاتے ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ جھرات کارروز آدمی رات کا وقت مزک سنان کیا دیکھوں کہ آگے ایک بکری جارہی ہے پچکبری بکری تھن بھرے ہوئے دل میں آئی کہ پکڑ کے گھر لے چلو جی اس نے ہرن کی طرح ایک چلا گنگ لگائی اب جو دیکھوں تو یہ بڑا کتا۔ بالکل مل ڈاگ میری جان سن سے نکل گئی پر جی میں نہیں توڑا۔ چلتا رہا۔ پھر کو دیکھو تو کتا غائب۔ ایک پچکبری اخڑ کوٹ تھوڑی دور تک وہ میرے آگے آگے دوڑتا رہا۔ پھر ایک دم سے غائب پھر کیا ہوا کہ جیسے کوئی پیچھے آ رہا ہے میں نے کہا استاد بمارے گئے

مگر میں اسی طرح چلتا رہا پھر میں نے سوچا کہ یار ہو گی سو یکجھی جائے گی۔ دیکھو تو سبی ہے کون۔ میں نے بھی ہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتا ہوں کہ وہی چیز چھپے آ رہی ہے۔

کون؟

جی صاحب بکری

بکری؟

اللہ پاک کی حشم بکری۔ میں میں وہی چکبری بکری۔ اے میاں باشاذ راستا پ پر روکنا۔

سیئی کی آواز کے ساتھ بس رکی اور میلی اچھن والا اپک کر بس سے اتر گیا۔

بھی اگلا ساپ بھی، لفظ نے کہا۔

سب اتر جائیں گے اس نے بس کا ایک نظر میں جائزہ لیا چوڑا چکلا آدمی لفظ سونے والا شخص بس تو واقعی خالی ہو گئی۔ وہ سارے لوگ جو زوراڑ رای جگد کے لئے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے لارہے تھے کیا ہوئے۔ اور وہ بھرے بھرے پچھائے والی لڑکی؟ اس کی اشتہ خالی پڑی تھی۔ اس وقت اسے پوری بس دیران اور اجازہ معلوم ہوئی۔ بس کا سفر کتنا مختصر ہوتا ہے اور اس کا جی چاہا کہ گئے ہوئے لوگ پھر آ جائیں وہ ایک دوسرے کو دھکیلے لازتے بھرتے لوگ اور اسے اس شخص کی تو قبر بھری محروم نظریں یاد آئیں جسے بس میں چڑھ کر اترتا پڑا۔ وہ شخص اب کہاں ہو گا؟ وہ لوگ جو اتر گئے۔ وہ لوگ جو سوارت ہو کے اور وہ شخص ہے پاؤں کانے کو جگ نہ لی کر چڑھا اور اتر گیا چھروں کا ایک ہجوم اس کے تصور میں منڈلانے لگا۔ اے اپنی بیدھ پ طبیعت پر بھی آئی کہ بس بھری ہو تو دم الالتا ہے اور خالی ہو تو خفقات ہوتا ہے۔ مگر میں اب کہاں جا رہا ہوں۔

کیوں بھی واپس جانے والی بس ملے گی؟

ملے نہ ملے ایسا ہی ہے۔ وقت تو ختم ہو گیا ہے۔

تو وقت ختم ہو گیا ہے؟ اس کا دل میٹھنے لگا پھر رفتہ رفتہ اسے ایک خوف نے آ لیا اور جب اگلے ساپ پر بس رکی تو اس نے بھی پاندھی کی لفظ کے پیچے پیچے دھکی اتر جائے اور وہاں کھڑے ہو کر واپس چلنے والی بس کا انتظار کرے۔ باہر اندر جرایی اندھیرا تھا۔ اور عمارتیں درختوں کی طرح خاموش کھڑی تھیں۔ اس نے جھپک کر سر اندر کر لیا۔

اگلے ساپ پر چوڑا چکلا شخص اتر جو تھوڑی دور تک کھبے کی روشنی میں نظر آیا پھر اندر جیرے میں کھو گیا۔ اس سے اگلے ساپ پر

دائری والابھی اتر گیا اور اسی طرح تھوڑی دور روشنی میں نظر آ کر کم ہو گیا۔ سنسان ویران ٹالپوں پر ایک ایک کر کے اترتے پھرستے مسافر اور اس کا دھیان ان گزرے ہوئے ٹالپوں پر گیا جہاں مسافر قلعوں کی صورت میں اترے اور گلیوں کی مشاہد بھر گئے اب بس خالی ہو چکی تھی اور سٹاپ پر جہاں تھاں اکیلا مسافر اترتا تھا اور تھوڑی دور تک روشنی میں نظر آ کر بھکی ہوئی بھیز کی طرح اندر ہرے میں کھو جاتا تھا۔ جب سٹاپ سنسان ہو جائیں اور مسافر کو اکیلا اترنا پڑے اور اس کی چھوڑی ہوئی تشت کوئی نیا مسافر آ کر نہ سنیاں لے تو وہ بسوں کا اخیر ہوتا ہے اور اس نے خالی بس کو پھر اپنے دکھتے کا ند ہے کو دیکھا جس پر سونے والے شخص کا سر رکھتا۔ اس شخص کے بارے میں ہمکلی مرتبہ اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ یہ شخص کہاں جا رہا ہے؟ پھر اسے تینک سا گزارا کہ کہیں وہ بھی غلط بس میں تو سوار نہیں ہو گیا تھا۔ اس میلے میلے سر کو سینے میں بھکی گروں کو اس نے پھر دیکھا اور جانا کہ سونے والا شخص اس کے دکھتے کا ند ہے کا حصہ ہے اور اس نے دل میں کہا کہ میں بس کے فریمنس تک جاؤں گا۔



کایا کلپ

شہزادہ آزاد بخت نے اس دن مکھی کی صورت میں صح کی اور وہ ظلم کی صح تھی کہ جو ظاہر تھا چپ گیا اور جو چھپا ہوا تھا وہ ظاہر ہو گیا تو وہ اسی صح تھی کہ جس کے پاس جو تھا وہ چھن گیا اور جو جیسا تھا وہی انکل آیا اور شہزادہ آزاد بخت مکھی بن گیا۔ شہزادہ آزاد بخت نے پہلے اس بات کو ایک خواب جانا۔ مگر صح ہوتے ہوتے یہ خواب وہ بھول چکا تھا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ جب شام ہوتی اور دیو گر جاتا تھا قلعہ میں داخل ہوا تو وہ سمنٹا چلا گیا۔ اس سے آگے اسے کچھ یاد نہ تھا۔ پھر شہزادی کی محبت میں وہ اتنا کچھ بھی بھول گیا۔ لیکن شام ہونے پر پھر وہی ہوا پھر دیو جیختا چلکھلاتا تھا قلعہ میں داخل ہوا مانس گند مانس گند اور یہ آواز سن وہ خوف سے سمنٹا چلا گیا۔ صح کو وہ پھر جیران ہوا کہ میں نے یہ کیسا ذرا اؤٹا خواب دیکھا۔ اس نے بہت یاد کرنا چاہا کہ رات کس عالم میں گزری۔ اور وہ خواب کیا تھا؟ پر اسے کچھ یاد نہ آیا۔

جب تین راتیں اسی طور گز ریں تو شہزادے کو تشویش ہوتی کہ الہی یہ کیا ماجرا ہے کہ شام ہوتے ہوتے میں اپنے آپ بھول جاتا ہوں مقرر کسی نے سحر باندھا ہے یہ سوچ کر اس نے اپنے تیس لامات کی کرائے غافل تو شہزادی کو سفید دیو کی قید سے رہائی دلانے آیا تھا اور خود سحر میں گرفتار ہوا۔ تب اس نے تکوار سوتی اور شام کا منتظر رہا۔ جب شام ہوتی اور دیو کی دھمک سے قلعہ کے درود یو ار بلے لگے تو وہ چوکنا ہوا۔ مگر اس نے دیکھا کہ شہزادی نے اس کی طرف من کر کے پھونک ماری اور وہ سمنٹا شروع ہو گیا۔ اس نے اپنے تیس بہت سنبالا لیکن وہ بے اختیار چھوٹا ہوتا ہی چلا گیا۔

وہ صح کو پھر ایک ڈرائے خواب سے جا گا اور یاد کیا کہ رات کس طور پر بیتی تھی مگر اسے کچھ یاد نہ آیا ہاں اس نے شہزادی کو پھونک مارتے دیکھ لیا اس کا تھا شکا کہ کچھ دال میں کالا ہے وہ اس سے مخاطب ہوا کہے بد انعام میں تجھے سفید دیو کی قید سے آزاد کرنے کے جتن کرتا تھا تو نے اس کا بدل رکھنے یہ دیا کہ مجھ پر سحر پھونکا۔ شہزادی نے بہت جیلے بھانے کے مگر شہزادہ کسی صورت مطمئن نہ ہوا اور حقیقت جاننے کے درپر رہا۔ تب شہزادی نے کہا کہ اے نیک بخت! میں جو کچھ کرتی ہوں تیرے بھٹک کو کرتی ہوں۔ سفید دیو

آدمی کا شن ہے اگر تجھے دیکھ لے تو چٹ کر جائے اور مجھ پر قلم توڑے۔ ہیں میں عمل پڑھ کر تجھے مکھی بناتی ہوں اور دیوار سے چپکا دیتی ہوں۔ رات بھروسہ ماں گند مانس گند چلاتا ہے اور میں کہتی ہوں کہ میں آدم زاد ہوں مجھے کھالے۔ پھر جب صبح کو وہ قلعے سے رخصت ہوتا ہے تو میں عمل پڑھتی ہوں اور تجھے آدمی بناتی ہوں۔

شہزادے نے جب یہ جانا کہ وہ رات کو مکھی بن جاتا ہے اور ایک عورت اس کی جان بچانے کے لئے یہ جتن کرتی ہے تو اس کی مردانہ غیرت نے جوش کھایا اور اس بات کو اپنی آدمیت اور شجاعت پر حرف جاتا۔ وہ یہ سوچ کر انگاروں پر لوٹنے لگا کہ اے شہزادہ آزاد بخت تجھے اپنی عالی نبی اپنی ہمت و شجاعت اور اپنے علم وہنر پر بہت گھمنڈتا۔ آج تم اگھمنڈ خاک میں ملا کر ایک غیر پیش تیری جس پر حکومت کرتا ہے اور تم توڑتا ہے اور تو تھیر جان کی خاطر دنیا کی سب سے تھیر گلوق بن گیا ہے۔ شہزادے کو پہلے اپنے آپ پر غصہ آیا پھر اس نے شہزادی پر غصہ کھا گیا۔ مگر پھر اس نے اس کی چشم پر نہیں اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔ جانتا چاہیے کہ وہ شہزادی شہزادے سے دور رہتی تھی اور کہتی تھی کہ جب اس قلم کے حلقت سے تھلیں گے تب ملیں گے اور شہزادہ اس سے قریب ہو کر دوری آگ میں جلتا تھا۔ پر آج شہزادی کا حال دگر تھا۔ شہزادے کے کڑھنے پر اس کی آنکھ بھرا آئی اور اس کے سینے پر سر کھکر بے اختیار ہو گئی۔ شہزادے کا دل مومن ہوا اور ہاتھ اس کی گردan میں حماکل ہوئے۔ بدن سے بدن کا ملنا بھی قیامت ہوتا ہے۔ ایک لس میں ساری دو ریاں دور ہو گئیں۔ ان میں شبِ صل کا رنگ پیدا ہوا اور شہزادہ اس گرم آغوش میں تن بدن کا ہوش کھو بیٹھا۔ اسے اس وقت ہوش آیا جب قلم کی دروڑی اور کمک سے پھر لرزنے لگے وہ سکرنے لگا۔ وہ بہت سنبھالا مگر سکر تاہی گیا اور سکر تے سکر تے ایک چڑا اس سپاہ نظر لگا اور پھر ایک بڑی ہی مکھی بن گیا۔

صحیح کو جب شہزادہ جاگا تو سہا سہا تھا اور اس خیال میں نفلطاس تھا کہ وہ تجھے مکھی بن گیا تھا تو کیا آدمی مکھی بھی بن سکتا ہے؟ اس خیال سے روح اس کی اندوہ سے بھر گئی اور وہ شہزادہ علم وہنر میں طلاق تھا۔ شجاعت میں فردہ عالی نسب صاحب وقار، جس کی ملک پر حملہ کرتا تھا قدم اس کے چوتھی۔ اس طور اس نے بہت سے صرکے مارے تھے اور بہت زیبیں تھیں تھیں کی تھیں پر غیدہ یو کے قلعے میں آ کر وہ عالی نسب صاحب جلال شہزادہ مکھی بن گیا تو اسے آزاد بخت تو اندر سے مکھی تھا اور اس نے اپنے پر ٹکوہ ماٹی کو یاد کیا۔ اپنی فتوحات اور کارناٹے یاد کئے اپنے ابجد کو خیر روزگار تھے یاد کیا۔ یہ سب اب اس کے لئے ماضی ہوا تھا اور وہ ماضی کو یاد کر کے رویا اور جب شام ہوئی تو وہ پھر سمنے لگا اور سمنے سمنے ایک مکھی کی صورت رہ گیا۔

توروز شام کو دیو گرجتا برستا قلعے میں داخل ہوتا۔ ماں گند مانس گند اور شہزادی کر سے جواب دیتی، یہاں آدم کہاں میں ہوں

مجھے کھالے۔ دیوی یعنی کر مطمئن ہو جاتا اور شہزادہ آزاد بخت بھی بنادیوار سے رات بھر چکار ہتا۔ صحیح کہ شہزادی منظر پڑا کہ اس پر پھونکتی اور وہ آدمی بن جاتا۔ پس شہزادے کی زندگی یہ فہری کہ دن میں آدمی اور رات کو بھی۔ اس نے اپنی اس زندگی پر بہت بیچ د تاب کھائے۔ شہزادی اس کا جی بہلانے کی کوشش کرتی اسے نہر و باغات کی سیر کرتی اور پھل پھول سے تواضع کرتی اور پھل پھول سنید دیو کے باغ میں بہت تھے۔ رنگ رنگ کے پھل باغ میں اور الوان و انواع کے کھانے دستخوان پر شہزادہ تو انہیں دلچسپی کر رجھتی بھی بن گیا۔ یہ لذتیں اور یہ آرام اسے فتوحات کی کشش زندگی میں کہاں نصیب ہوئے تھے۔ تو شہزادہ آزاد بخت دن کو دیو کے دستخوان کی بھی بنا رہتا اور رات کو بھی بن جاتا دن اس کے لئے شب و صل تھے کہ شہزادی اس کی آغوش میں ہوئی اور رات کی ساری کدورت دور کر دیتی۔ مگر پھر رفت رفت راتیں لبی اور دن چھوٹے ہونے لگے اور شہزادہ دیر تک بھی کے قابل میں رہنے لگا مگر اس نے اس میش و آرام سے لبریز چھوٹے سے دن کو بھی کالمی راتوں کا انعام جانا اور مطمئن رہا مگر پھر ایسا ہوا کہ بھی بھی دن میں اسے فوراً دھیان آ جاتا کہ یہ دن ہے اور میں ابھی آدمی کی جوں میں ہوں لیکن ہوتے ہوتے یہ واقعہ طویل ہو گئے وہ شہزادی کی میٹھی آغوش میں پڑے پڑے سدھ بدھ بھول جاتا اور دیر تک اس گمان میں رہتا کہ وہ بھی بن گیا ہے۔ پر جب شہزادی بانہوں کے حلقتے میں کسماتی تو اسے لیکا ایک دھیان آتا کہ ہنوز دن ہے اور وہ آدمی کی کھال میں ہے پھر اسے ہوش کے عالم میں بھی تک رہنے لگا بھی دیو کے باغ میں پھل پھول پہنچتے ہوئے، بھی لذتیں غذاوں اور مشروبات سے آ راستہ دستخوان پر پہنچتے ہیئے اسے ایک تک آ گھرتا کیا میں آدمی کی جوں میں ہوں اور پھر اسے بہت سے اندریشوں و مسوؤں اور ٹکنوں نے گھیر لیا۔

شہزادہ آزاد بخت نے اندریشوں و مسوؤں اور ٹکنوں کے گھرے کو توڑنے کی سماں کی اور دیو سے پہنچنے کی بھی باندھی اور بار بار شہزادی نے سمجھایا کہ سنید دیو کی جان تو طوٹے میں ہے اور طوطا سات سمندر پار ایک درخت ہے اور درخت میں ایک بچرہ لکھتا ہے بچرہ میں وہ طوطا ہے شہزادہ آزاد بخت اس پر بھی حیران ہوا کہ سنید دیو یہاں ہے اور جان اس کی سات سمندر پار ایک طوٹے کے اندر ہے۔ جان کا جان سے جدا اور دور ہوتا ہے عجیب لگا اور اسے خیال آیا کہ اس کی جان بھی تو کہیں اس سے درجیں ہے تو کیا میری جان بھی میں ہے؟

شہزادہ دونوں اس فلک میں غلطان رہا کہ کس تدبیر سے قلعے سے نکلے اور سات سمندر پار جا کر طوٹے کی گردان مرودی سے اور شہزادی جب اسے زیادہ فلک میں غلطان دیکھتی تو ٹکنوے ٹکایت کرتی کہ تیری محبت سرد ہے، تو مجھ سے دغا چاہتا ہے اور شہزادہ کہ شہزادی کی محبت میں دیوانہ تھا۔ سو سو طرح سے وفا کا یقین دلانے لگا اور ان ٹکنوں اور صفائیوں میں دیو کی قید سے رہائی کا سوال رفت گزشت

شہزادہ آزاد بخت اب شہزادی کی مریضی کے تابع تھا۔ اس کی مریضی کے بغیر پہنچ توڑتا۔ اس کی ایک پھونک سے مکھی بن جاتا اور ایک پھونک سے آدمی کی قالب میں واپس آ جاتا پھر یوں ہوا کہ شہزادی کے پھونک مارنے سے پہلے ہی شہزادہ سمنے لگا اور صبح کو شہزادی کے پھونک مارنے کے بعد تک نہ حال پڑا رہتا تھی وہ مکھی کی جون سے نکل آ ہو۔ مگر آدمی کی جون میں واٹش ہوا ہو۔ درمیانی و قفس طبلیں سے طوبیل تر ہوتا گیا اور اس کا ضعف اور اذیت بڑھتی گئی۔ شام کو وہ پھرتی سے آدمی سے مکھی بن جاتا، مگر مکھی سے آدمی کی جون میں آنا اس کے لئے اذیت کا ایک لمبا عمل ہوتا پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ اذیت کا لمبا عمل گز رجانے پر بھی ایک اذیت کی کیفیت کے ساتھ یاد آتا رہتا۔ اور اس نے ایک روز اذیت کے عالم میں سوچا کہ میں آدمی ہوں یا مکھی ہوں۔ یہ سوال اس کے دماغ میں آج پہلے پہل پیدا ہوا تھا اس پر وہ بہت گزر گرا۔ پہلے اس نے سوچا کہ میں پہلے آدمی ہوں بعد میں مکھی ہوں میری اصل زندگی میرا دوں ہے میری رات ایک دھوکہ ہے۔ اس نے ایسا سوچا اور مصلحت میں ہو گیا مگر آپ پی آپ اسے اس خیال پر نکل ہونے لگا۔ شاید میری رات ہی میری اصل زندگی ہو اور میرا دوں میرا ہبہ و پہلو تو شہزادہ آزاد بخت ایک دفعہ پھر ٹکوں، اندر یشوں اور وسوسوں کے گھرے میں آ گیا اور اس ادھیر بن میں لگ گیا کہ اس کی اصل کیا ہے میں اصل میں آدمی ہوں مگر مصلحت مکھی بن گیا ہو مگر پھر اسے خیال گزر اک یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اصل میں مکھی ہو اور درمیان میں آدمی بن گیا ہو ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹی ہے میں کہ مکھی تھا پھر مکھی بن گیا ہوں۔ اس خیال سے اسے بہت گھن آئی۔ اس نے جلدی سے روک دیا مگر کیا واقعی میں آدمی ہوں کوشش کے باوجود شہزادہ اپنے تینیں اس کا لقین نہ لاسکا آخراں نے سمجھوتے کا ایک راستہ نکلا اور میٹے کیا کہ وہ آدمی بھی ہے اور مکھی بھی۔

تو شہزادہ آزاد بخت اب آدمی بھی تھا اور مکھی بھی۔ اور مکھی نے آدمی سے کہا کہ میں رات کو تیری حفاظت کرتی ہوں تو مجھے اپنے دن میں شریک کر لے اور آدمی نے مصلحت سے کہا کہ میں نے سن اور میں نے تجھے اپنے دن میں شریک کیا اور اس کے دن دور گئے ہو گئے صحیح کو اذیت کے ایک لبے وظیفے کے بعد وہ مکھی کی جون سے آدمی کے قالب میں آتا اور مکھی کی مشال دیو کے میٹھے چلاؤ اور لذیذ کھاؤں پر ٹوٹ پڑتا۔ لذت دیش میں وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا مگر اچانک دیو کا سایا اس کے تصور میں منڈلاتا اور اسے لگتا کہ وہ سست رہا ہے قلعہ میں محصور دیو کے تصور سے خوف زدہ شہزادی کے غصے سے سہا ہوا۔ ہر دم اسے لگتا کہ وہ سست رہا ہے چھوٹا ہوتا جا رہا ہے جیسے وہ بھی مکھی بن جائے گا وہ بڑی مشکل سے اپنے تینیں سنبھالا اور مکھی کے قالب میں گرتے گرتے تھے واپس آتا۔ ہر دم اسے وہم رہتا کہ وہ اندر ہرے میں کسی گھرے گزھے کے کنارے چل رہا ہے۔ اب اس کا پاؤں پھسلا اور اب وہ آدمی سے مکھی بنا۔

شہزادہ آزاد بخت کہ اب مکھی بھی تھا اور آدمی بھی۔ اپنی دورگی مصلحت آمیز زندگی سے خود ہی بیزار ہو گیا اور گھرے گزئے کے سنارے چلتے ہوئے سبھے آدمی نے کہا کہ کسی طور دیو کو ختم کیا چاہیے کہ دورگی ختم ہوا اور میں خود فتحار بنوں۔ پر شہزادہ آزاد بخت میں اب اتنا وہ کہا تھا کہ وہ دیو سے لائے۔ اس نے دیو سے لانے کے قادے سے لٹکنے کے سات سمندر پار جا کر طوٹے کی گردان مرزوئے کے سوسو منصوبے بنائے۔ مگر پھر خود ہی ڈاؤں ڈول ہو گیا۔ اس نے قلعہ کی اوپنی فصیلیوں کو دیکھا اپنے ضعف تو انہی پر غور کیا۔ دیو کی گھن گرج کو دھیان میں لایا اور اس کا دل اندر رکھنے کی مثال بننے لگا تو پھر بالکل مکھی بن جا کر نہ قلعہ کوئی مقنی رکھنے دیو کا کوئی خوف رہے کہ دیکھیوں سے خطرہ گھوٹے نہ کرتے مگر شہزادے کا جی اس پر بھی نہ لکا اس وہ متذہب کے عالم میں بھی میں انکار بنا اور اس کے اندر کی مکھی بڑی اور تو یہوتی چلی گئی اور رات کا سایدین پر گھر اہوتا چلا گیا۔

شہزادے کو شروع میں ایک خیال سا ہوا تھا کہ شاید اس کے اندر کہیں بہت گھرائی میں ایک فتحی مکھی بھجنماری ہے اس نے اسے وہنم جانا اور درکرد یا پھر رفتہ رفتہ اسے خیال ہوا کہ کہیں وہ جج چج مکھی ہی نہ ہو تو مکھی میرے اندر ہی پلی رہی ہے؟ اس خیال سے اسے بہت گھن آئی چیزے وہ اپنی ذات میں نجاست کی پوٹ لئے پھر رہا ہو۔ چیزے اس کی ذات دو دھنگی تھی اور اب اس میں مکھی پڑ گئی ہے۔ دن گزرتے گئے اور رات دن کا روپ بہروپ بہروپ جاری رہا۔ قلعہ سے لٹکنے کی صورت کی طور پیدا شہزادے کے لئے مکڑی کا جالا بن گیا مکھی نے اپنی سوئی اسکی ٹانگیں خوب چلا کیں اور نئے پر پھر پھر اپنے پھر بے دم ہو کر اٹی ایک گھنی اور جالا شہزادے کے اندر سامنے لگا۔ باہر کی دنیا سے اس کا ناطئ نہ نئے گا چیزے اس کے ماظن پر کسی مکڑی نے جالا پورا یا تھا کہ اب قلعے سے باہر کی دنیا اس کے تصور میں دھنڈ لاتا تھا کہ وہ آئے گا اور سفید دیو کی قید سے رہائی دلائے گا۔ مگر پھر اس کے تصور میں جالا پھیلانے لگا اور اس نے سوچا کہ میرا باپ کوں تھا۔ وہ یہ سوچ کر جران ہوا کہ باپ اس کا کون تھا کہ اس کا نام اسے یاد کہیں رہا تھا۔ عجب ہوا کہ جب اس نے یہ سوچا تو وہ اپنा� نام بھی بھول گیا۔ تب وہ بہت پریشان ہوا اور یاد کرنے لگا کہ نام اس کا کیا ہے؟ نام! اس نے کہا کہ حقیقت کی کنجی ہے۔ میری حقیقت کی کنجی کہا ہے؟ ایک مکھی تھی وہ اپنا گھر لیپ رہی تھی۔ گھر لیپتے لیپتے وہ اپنा� نام بھول گئی۔ مگر لپتا چھوڑ ہو اپنی جگہ سے اڑی اور در در اپنा� نام پوچھتی پھری ہر کوئی اسے دھکا رہتا۔ وہ پھر کے پاس گئی اور کہا۔

پھر پھر میرا نام کیا ہے؟

اس نے دھکا رادر مجھے کیا پڑتے تیر نام کیا ہے؟ پھر وہ بھیں کے پاس گئی اور کہا بھیں بھیں میرا نام کیا ہے؟

بھیں کا تھسا برا تھا اس نے جواب نہیں دیا۔ اسی طرح آنکھیں موند بھگالی کرتی رہی اور اس اپنی پوچھے بلا دی۔ اور شہزادہ آزاد بخت اپنا نام بہت یاد کیا پر اسے اپنا نام یاد نہ آیا اور وہ بے حقیقت بن گیا جیسے وہ سب کچھا پنے بچھے جنم میں تھا اور جیسے یہ اس کا نیا جنم ہے کہ اس میں وہ شخص اور خالص ملوق ہے یہ سوچ کر اسے بے کلی ہوتی اور اس نے کہا کہ میں دوسری ملوقات سے خود کو کیے علیحدہ کروں۔ تب اس نے سوچا اور دھیان کیا کہ اس کا نام کیا تھا اس کے باپ کا نام کیا تھا اور وہ کون لوگوں میں تھا اور کس زمین پر تھا پر اسے کچھ یاد نہ آیا اس کے اندر کا جالا پھیلتا ہی چلا گیا اور اس نے کہا کہ میں جو تھا وہ ماشی ہوا وہ میں ہوں جو میں ہوں تو وہ اب تھا جواب وہ تھا اور اب کمھی اس کی بڑی اور قوی ہو چلی تھی اور اس کا آدمی ماضی بتا جا رہا تھا کمھی کی جوں سے واپس آتا اس کے لئے اب بڑی صیبیت ایک کرب بن گیا تھا جب وہ جا گتا تو اسے اپنا آپ میلائے افطر آتا۔ طبیعت گری گری سی بدن ٹوٹا ہوا جیسے رات بند بند الگ ہو گیا تھا اور بھی بند پورے طور پر جز نہیں پائے تھے وہ پھر آنکھیں بند کر لیتا اور آدھ سوئی حالت میں دیرستک پڑا رہتا پھر وہ اک سماہت کے ساتھ انتہا اور اپنے آپ کو میلایا پکر باغ میں جاتا اور شہر جس کا پانی موٹی کی مثال چکلتا تھا دیرستک غسل کرتا پر جب وہ غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلتا تو اسے رات کا خیال آتا اور آپ سی طبیعت مکدر ہو جاتی، اسے لگتا کہ اس کے شور کے عقب میں کوئی چیز بھنسناری ہے وہ پھر نہایتا اور پھر اپنے تیس میلایا پاتا اسے مٹلی ہونے لگتی اور اسے اپنے آپ سے گھن آتی۔

متلی اس کی طبیعت کا حصہ بن گئی اور اسے مستقل آپ سے گھن رہنے لگی۔ اس کا اضھال بڑھتا چلا گیا ایک طویل کرب اور سخت کشمکش کے بعد وہ کمھی سے آدمی بتا اور نہ حال پڑا رہتا اسے ہر چیز میکی اور غلیظ نظر آتی تھا کہ دیواریں درختوں کے پتے نہ کہ کاپانی تھی کہ شہزادی بھی اسے لگتا کہ وہ مری ہوئی کمھیوں کے انبار میں دبایا ہے اور خود اس کے اندر کی کمھی بڑی اور قوی ہوتی جلی جا رہی تھی۔ اسے وہم ہونے لگا کہ اس کے اندر بھنسناتی ہوئی کمھی اس کی روح میں اتر رہی ہے کمھی اسے لگتا کہ شہزادی نے صبح کو سرخ نہیں توڑا تھا اور وہ کمھی ہنا ہوا دیوار سے چٹا ہے۔ کمھی لگتا کہ اندر کی کمھی باہر نکل آتی ہے اور اس کے وجود پر پھیل گئی ہے۔ شام کو شہزادی کے پھونک مارنے سے پہلے وہ سمنئے لگتا اور صبح کو پھونک مارنے کے بعد دیرستک نیم بے ہوٹی کی حالت میں پڑا رہتا۔ اسے لقین نہ آتا کہ وہ پھر آدمی بن گیا ہے وہ کمھی کی جوں سے نکل آتا اور آدمی کی جوں میں دیرستک نہ آتا کہ وہ پھر آدمی بن گیا ہے وہ کمھی کی جوں سے نکل آتا اور آدمی کی جوں میں دیرستک نہ آتا کہ یہ میل روز بروز یادہ ذیت ناک ہوتا جا رہا تھا۔ دن بھر وہ حیران و پریشان رہتا۔ جیسے وہ اپنی جوں میں نہیں ہے جب دن ڈھلنے لگتا تو اسے اطمینان ہونے لگتا۔ شام کے وقت جب دیو چینچن چلکھاڑتا تھا قلعہ میں قدم رکھتا تو خوف اور سکون کی ایک ملی جلی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی اور پھر وہ کمھی کی جوں میں مگن رہنے لگا۔

پھر یوں ہوا کہ وہ بکھی کی جوں میں لگن رہنے لگا اور بکھی کی جوں سے آدمی کی جوں میں واپس آتا اس کے لئے قیمت بن گیا۔ بکھی کی جوں چھوڑتے ہوئے اسے ایسا لگتا جیسے روح قلب کو چھوڑتی ہے پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ بکھی کی جوں سے بہت کرب و اذیت سے لکلا اور آدمی کی جوں میں دیر تک نہ آیا۔ اسے یوں لگا کہ وہ ایک صدی سے درمیانی کیفیت میں بھٹک رہا ہے اور اس روزون بھر اس پر سیکھی عالم رہا جیسے وہ بکھی سے آدمی نہیں بن سکا ہے جیسے وہ عموری منزل میں بھٹک رہا ہے اس نے اپنے آپ کو بار بار دیکھا اور کہا میں آدمی نہیں ہوں تو پھر میں بکھی ہوں؟ مگر اس وقت وہ بکھی بھی نہیں تھا تو میں آدمی بھی نہیں ہوں اور میں بکھی بھی نہیں ہوں، پھر میں کیا ہوں؟ شاید میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس خیال سے اسے پیندا آنے لگا اور اس نے سوچا کہ نہ ہونے سے بکھی ہوتا چھاہے۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا کہ آج اس کے خیال کی روؤہ حقیقی کی ماندر ک رک کر چل رہی تھی۔

شہزادی اس کی یہ غیر حالت دیکھ کر متوجہ ہوئی اور دل میں پچھتا ہی کہ سب خرابی اس کی لائی ہوئی ہے تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب شہزادے کو بکھی نہیں بنائے گی پھر اس نے یہ تدبیر کی دن ڈھلنے شہزادے کو تہبہ خانے میں بند کر دیا اجب دن ڈھلنا اور قاحر کے درو دیوار دیوبکی دھمک سے لزنے لگے تو وہ روز کی طرح سہم گیا اور آپ ہی آپ سمنٹا چلا گیا۔

اس رات دینماں گندماں گندنہیں چلا یا۔ اس پر شہزادی کمال حیران ہوئی کہ جب میں شہزادے کو بکھی بنادیتی تھی تب بکھی اس کی آدمی والی بوباتی رہتی تھی اور دینماں گندماں گند چلاتا تھا۔ آج کیا ہوا کہ میں نے اسے بکھی نہیں بنایا۔ مگر دیوبکھی ماں گندماں گندنہیں چلا یا۔ شہزادہ آزاد بخت کی آدمی والی بوکیا ہوئی؟

خیر جب رات گزری اور صبح ہونے پر دیور خست ہوا تو شہزادی نے تہبہ خانہ گھولا پر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں شہزادہ نہیں ہے اور ایک بڑی سی بکھی بیٹھی ہے وہ دیر تک شش و چھٹی میں رہی کہیے کیا ہوا اور کیسے شہزادہ خود ہی بکھی بن گیا۔ پھر اس نے اس پر اپنا منزہ پڑھ کر پھوٹکا کہ وہ بکھی بن جائے پر اس کے منزہ نے آج کچھ اثر نہ کیا، شہزادہ آزاد بخت نے اس روز بکھی کی جوں میں صبح کی۔



ٹانگیں

چونگ زدنے خواب دیکھا کہ اس کی جوں بدل گئی ہے صبح الٹھ کروہ سخت حیران ہوا اور سوچتا رہا کہ کیا وہ واقعی آدمی نہیں رہا ہے اور وہ یہ طے کر پایا کہ وہ آدمی ہے یا آدمی نہیں ہے اور یا میں نے چاک بیک طرف رکھا اور کہا۔
سید صاب وہ میرا شہزادار تھا اور اس حرامزادے نے میرے ساتھ یہ کیا آدمی سالے کا کوئی اعتبار ہے۔
وہ یہ طے کر پایا کہ اس سوال کیا جواب دے سکریا میں اس کے جواب کا منتظر بھی نہیں تھا۔ وہ پھر شروع ہو گیا۔ صاحب یہ گھوڑی سدھتے سدھتے ہی سدھتے ہی اور سدھد بھی جائے تو میرے گھوڑے کی طرح کی تو نہیں ہو گی۔ سید صاب، وہ کوئی گھوڑا تھا، آدمی تھا، بہت وفا کی اس نے مجھ سے وہ رکا اور پھر بولا۔

”بڑی مشکل ہے جی میں نے یاں والوں کو سب کو بتا رکھا تھا کہ یہ میرا شہزادار ہے اس کی مروت بھی جواب میں اگر کہوں کہ وہ میرا گھوڑا کھوں کے لئے گیا تو جی کتنا کھیانا پڑوں گا مقدمہ کروں تو سب من میں گو دیں گے کہ یا میں نے شہزادار کو پکڑا وادیا۔“
گھوڑی چلتے چلتے پھر رک گئی مگر اس مرتبہ وہ اڑی نہیں تھی۔ ایک بڑا سادرخت گراہوا سڑک کے آر پار پڑا تھا۔ یا میں نے اتر کر گھوڑے کی باگ پکڑا اور اسے کچے میں اتار گھوڑی دور چلا چند قدم کے بعد وہ پھر اسے کچی سڑک پر لے آیا تاگہ میں بیٹھنے ہوئے بولا:

”سید صاب آندھی بہت سقت چلی تھی، بہت بیڑا گرا ہے۔
ہاں بہت نقصان ہو گیا۔

مگر سید صاب اس کی آواز دسمی پڑ گئی جیسے کچھ سامگیا ہو۔
دا ان صاب کے بینا رکھی گر گئے۔ یہ کیسے ہوا کچھ میں نہیں آئی بات۔
آندھی بھی تو بہت تیز تھی۔ اس نے قدرے بے تعاقی سے جواب دیا۔

سید صاب آندھیاں آگے بھی بہت تیز چلی ہیں۔ سیالب بھی آئے ہیں دریا اتا کے قدم پر جو منے تو بہت دفعہ آیا پر سیزھیاں نہیں
چڑھا۔ کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ سمجھ میں نہیں آئی بات۔ میری تو عقل حریان ہے۔ اچھا یا مولا۔

اس نے خند انس بھرا۔

تیرے بھیج تو ہی جانے۔

یاسین خاموش ہو گیا اور ادھر اس کا ذہن اور طرف بھکٹنے لگا۔ داتا در بار، علی بن عثمان جلانی۔ کشف الحجب اور وہ فقیر جو اس امام
کے پاس کر دیجئی جاہ و اقتدار میں ملوث ہو گیا تھا آیا اور کہا سے فلانے اب مر جانا چاہیے۔ امام نے سن اور وہ خاموش رہا دوسرا دن
وہ فقیر آیا اور امام نے اسے قبر بھری نظر و سے دیکھا اور اس کے بولنے سے پہلے بول پڑا کہ اسے فلانے اب مر جانا چاہیے۔ یہ سن کر
فقیر نے مصلے کو بھجا یا اس پر دراز ہوا اور اعلان کیا کہ میں مر گیا اور وہ مر گیا۔ عجب ہم کے فقیر تھے وہ بھرے بازوں میں چلنے
نعروہ لگاتے کہ میں مر گیا۔ اور مر جاتے کبھی ایسٹ پر سر کھکھل کر کبھی کھڑے کھڑے کبھی بیٹھے بیٹھے۔

بھیا چھرے کی سواری لے لے۔

نبیں میا، اس نے سخت بے اعتنائی سے جواب دیا۔

لے چلتے کیا ہرن تھا۔

نبیں سید صاب یا سین خاموش ہو گیا۔ پھر اس گھوڑے کو چاکب مارتا تھے تیز ہو گیا۔ سید صاب رات کو میں عورت کی سواری نہیں
لیتا، وہ پھر خاموش ہو گیا اور ساتا نگہ تیز چلتا رہا اور پھر وہ بولا صاب ایک دفعہ کی بات سناؤں رات کے دس بجے ہوں گے جی میں چو برجی
پر کھڑا تھا کچھ میں اونگک ساگی چھم چھم پھکوؤں کی آواز کان میں آئی چونک پڑا کہ یہ پھکوؤں والی یاں کہاں سے آگئی۔ گھوڑے نے دانہ
کھاتے کھاتے ایک ساتھ منہ اٹھایا اور زور سے ہنہتایا پھر کتے بھونکنے لگے میں نے کان لگایا۔ میانی صاب والی مڑک ہے نہیں ادھر
سے آواز آرہی تھی اور جی پھر چشم سے وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تانگہ والے چلتے گا۔ سید صاب عورت اتنی خصوصیت کہ میرا دل
یوں یوں کرے پر میری نظری ایک ساتھ اس کے ہجڑوں پر جا پڑی۔ بس جی میرا جی سن سے نکل گیا۔ میں نے کہا کہ یاسین آج
مارے گئے پھر جی میں نے سوچا کہ جو کرے کرتا آؤ دیکھا نہ تاڈبڑھ کے چونٹا پکڑی اور ایک بال توڑ لیا۔ اب تو وہ میرے قدموں
میں گر پڑی۔ سید صاب پچھلی پانی کا بال مٹھی میں لے لو پھر وہ تمہاری باندھی ہے۔ میں نے وہ بال زمین میں داپ دیا بس جی پھر وہ
میری باندھی بن گئی۔ بہت مڑے کئے میں نے اس کے ساتھ۔ یاسین نے مڑے میں آ کر اونچا سانس لیا پھر گھوڑی کو زور سے چاکب

پر مجھ سے چوک ہو گئی اور چوک کیا ہو گئی کہ کوئی بھی عورت ہو گود میں رکھ کے رو پڑے پھر دیکھوں کون سامنہ ہے جو نظرے گا تو بھی میں پھر گیا، میں نے اس کا بال اسے دے دیا بال مٹا تھا کہ یہ جاؤ جائیں نے بہت دہائی وی مگر صاب وہ صاف ہو گئی۔
کیوں بھی اچھے جانا ہے۔ ایک رات مگر نے سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے آواز لگائی۔
سید صاب ایک سواری لے لوں؟ تکلیف تو نہیں ہو گئی۔

ہاں پاں لے لو۔

یاسین نے تانگ روکا مگر دوستے روکتے پھر لگام ہلا دی۔ نہیں باہو۔
کیوں لے لو نا سواری۔
نہیں جی، ہماری باتوں میں خلل پڑے گا۔
تمہاری مرخصی۔

سید صاب نے بہت دنیا دیکھی ہے۔ یاسین پھر شروع ہو گیا۔ یہ سامنے والا گند آپ دیکھ رہے ہیں دن میں کبھی غور سے دیکھنا
کھلے ہوئے تربوز کی طرح رکھا ہے کہ جیسے ابھی چکلی مارے سے بکھر جائے گا۔ اس پر سلام لگم رکھی ہے۔
سلام لگم رکھی ہے؟ کیا مطلب۔ وہ بہت چکرایا۔

چکردار بات ہے ذرا۔ بات یہ ہوئی، سید صاب کہ ایک رات میں راوی روڈ سواری لے گیا۔ بڑھے دریا سے بھی آگے کی سواری
تھی۔ خیر سواری کو تو میں اتارا آیا رستے میں ہو گئی بارش، میں نے تانگ ایک طرف ایک گھنے سے پیڑ کے نیچے کھڑا کر لیا۔ لوگی میں پیڑ
کے نیچے گیا ہوں کہ اوپر سے دھم سے ایک منڈا نیچے کو دپڑا۔ میں نے کہا کہ بے یاسین آج ڈاکو سے نکر ہو گئی ہو جائیں ذرا دو دو تھک
میں جوانی کی تڑ میں تھا۔ تانگ سے کو داں سے لپٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھوں ہوں کرو وہ لمبا ہو رہا ہے۔ میں حریان کر کیا چکر
ہے لمبا ہوتے ہوتے اس کا سر درخت کی سب سے اوپر والی پہنچ سے جا گا اور میں اس کی تانگوں سے لپٹا رہ گیا اور تانگیں اس کی
بکرے کی۔

بکرے کی تانگیں اس نے تجھ سے سوال کیا۔

”ہاں جی، ان کی تانگیں بکروں کی ہو وے ہیں تو جی میں نے کہا کہ بے یاسین آج مارے گئے پر جی میری کاٹھی بھی اس وقت

ہی ہوئی تھی۔ یا مولا کہہ کے میں اس سے پٹ گیا نہیں گروں نہ وہ گرے۔ آخ کو جی صح ہو گئی۔ پھر اس کا زور ٹوٹنے لگا۔ میں نے کہا کہ بے یا میں اب اسے ڈھانے پر وہ نکلا چالاک۔ اس نے مجھ سے صلح کر لی اور کہا کہ دیکھی تو میرے علاقے میں مت آمیں تیرے علاقے میں نہیں آؤں گا۔ میں نے شرط مان لی پر جی میں نے گھر آ کر جو چچا پائی سے کمر لگائی ہے تو بھی بڑی چورا۔ تین دن تک بخار میں بختار ہا اور جب میں انخواہ اور تانگ جوڑا تو اسی سڑک پر مجھے ایک آدمی ملا۔ وہ پھری کا دخت تھا۔ سڑک بالکل خالی بولا کر بھی راوی روڑ گیا تھا میں وہاں والے نے تھجے سلاماً لکھ کی ہے۔ بس جی میں نے ایک سکنڈ سوچا اور کہا کہ اسے سامنے والے گنبد پر رکھ دے۔ اس نے سلاماً لکھ اس گنبد پر رکھ دی اور گنبد چٹا خ سے بولا اس پر دراثتیں ہی دراثتیں پڑ گئیں اور وہ آدمی میانی صاب کی طرف مزگیا۔ تو جی میں بال بال فیکھیا کہیں سلاماً لکھ لے لی ہوتی تو بولی بولی اڑ جاتی۔“

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ مگر ایک شک بھری نظر سے یا میں کو سر سے پھر تک دیکھا مگر یا میں اپنی جگہ بہت مطمئن تھا۔ ”سید صاب دیکھو کیا ہو یہ تو میں نے ایک سنائی ہے۔ میں نے بڑے بڑے مجھے لئے ہیں۔ ایک دفعہ ایک لکھنے سے کشتی ہو گئی میں نے سارے کوہر پکا۔ یا میں کی اس بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

جی آپ کو قیمتیں نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ جی کہ ان دنوں میری کاشتی بہت اچھی تھی اور کیوں اچھی نہ ہوتی۔ روز صح کو ادھیر بارادام پھیں کے کھانا تھا اور خوب زور کرے تھا۔ اب کاشتی کیسے بننے سائز ہے سول روپے من تو آٹا کب رہا ہے۔ وہ رکا پھر بولا۔ سید صاب مہنگائی اب تو بہت ہو گئی۔ دان گیہوں کے بھاؤ ہو گیا اور گیہوں مویوں کے بھاؤ کب رہا ہے۔ آپ جی اخبار میں ہیں اس کے خلاف کچھ لکھتے نہیں۔“

لکھتے ہیں اس نے رکتے رکتے کہا، پر لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

لکھنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ یا میں کو سخت تجوہ ہوا۔

پھر اسے خود تجوہ ہونے لگا لکھنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ لکھنے سے اگر کچھ نہیں ہوتا تو اتنا کیوں لکھا جاتا ہے؟ اور اگر کچھ نہ لکھا جائے؟ فرض کیجئے کوئی کچھ نہیں لکھتا؟ پھر؟

سید صاب چینے کا مژہ نہیں رہا اور اس فقیر نے اس امام کے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ اسے فلانے اب مر جانا چاہیے۔

سید صاب پر جو بہت باتیں کریں ہیں آپ کے دوست ہیں؟

ہاں۔

یہ شاعر ہیں؟

ہاں بہت بڑے شاعر ہیں
پر لگتے تو نہیں۔
کیوں نہیں لگتے بھائی۔

جی انہوں نے جالندھرو والے سے وعدہ کیا تھا کہ گورنمنٹ میری دوست ہے اس سے جیسی کامیابیں دلوادوں گا۔ اسے ڈور پر لگا رکھا ہے۔ پر ابھی تک لمبیں دلوایاں نہیں وہ بیچارہ ان کے پیچے پیچے پھرتا پھرے ہے دیکھا ہو گا آپ نے جالندھرو والے کو بہت غریب ہے بیچارہ۔
ایک دبالتا سکین صورت تانگہ والا اس کے تصور میں ابھرنے لگا۔ اپنے پیٹ سے بیزار اور دندنوں کی گلفرمیں جلا۔ سید صاب جی میں جیسی چلانا سیکھ رہا ہوں۔

اچھا؟

ہاں جی میں نے ایک تکمیل والے سے بات کر لی ہے وہ مجھے ایک بفتہ میں چلاتا سکھاوے گا شاہ صاحب کی گورنمنٹ سے دوستی ہے۔ وہ مجھے لمبیں دلادیں گے بات یہ ہے کہ سید صاب جی کرتانگہ سے گزارہ نہیں ہوتا۔ بہت جیسی چل پڑی۔ صاب جی بڑی سواری اب تانگہ میں نہیں بنتی۔

سید صاب یاسین نے پھر سوال اٹھایا یہ جی آپ کے دوست سے گورنمنٹ کی سچی بھی دوستی ہے؟
ہاں ہو گئی ہی۔

پر لگتی نہیں وہ رکا، پھر بولا بات یہ ہے جی کہ اگر دوستی ہے تو پھر بیچارے کو لمبیں دلادیں۔ بغیر سفارش کے تو کوئی کام نہیں ہوا کرتا تا۔ سید صاب یہ جالندھرو والا جالندھر کارہنے والا ہے۔ چٹل میں آیا تھا۔ اس کا سارا کلام کٹ گیا، اکیلا بچا ہے، اس جھی سے اکھڑا اکھڑا ہے اس نے کئی کام کئے پر سب قلیل ہو گئے۔

چٹل کے ذکر سے اس کا ذہن بھکرا اور ان دنوں کی طرف گیا۔ جب شہر اجزر ہے تھے اور قبیلے ڈھل رہے تھے۔ اجزتے خالی ہوتے شہر۔ پرانا عہد نامہ سیمیون کے لئے اجزتے کی داتا نیں پرمیاہ تی کا نوح ان کے لئے جو تکوار سے قتل کئے گئے اور ان کے لئے جو بھوک سے مرے وہ جو تکوار سے قتل کئے جاتے ہیں ان سے بہتر ہیں جو بھوک سے مرتے ہیں کہ کھیتوں کے پھل نہ پانے سے وہ

سوکتے جاتے ہیں اور مرتے رہتے ہیں۔ اے خداوند جو کچھ ہم پر ہوا سے یاد رکھ ہم نے اپنا پانی بھی مول لے لے کے پیا۔

سید صاب آپ دلی کے ہیں؟
نہیں بھی۔

دلی کا تو میں بھی نہیں پروں ریا بہت ہوں۔ ادھر تی کا ہوں۔ صاب دلی کی جمع مسجد لوہا لائھہ ہے۔ جب فساد ہوئے تھے تو نگہ والوں نے اسے پھوٹکنے کی مخفی پر مسجد جل کے نہیں دی۔ اس ایک داعش پر گیا۔ میں جی آنے کے بعد ایک دفعہ دلی گیا تھا، میں نے اس داعش کو دیکھا تو جی میں روپڑا۔

یاسین کی آواز کسی قدر بھرا اگئی۔ وہ خاموش ہو گیا پھر آہستہ سے بولا۔

سید صاب ایک بات پوچھوں دلی کی جمع مسجد کو ہندوؤں نے آگ لگائی پر دفات صاب کے میارکس نے گرائے؟ دفات صاب کے میارکس نے گرائے؟ عجب سوال ہے۔ یہ لوگ بھی کتنے تو ہم پرست ہوتے ہیں! اور جب وہ یہ سوچ رہا تھا تو تانگ نے مرنگ چوگنی کے چپوتے کا چکر کانا اور پنواڑیوں کی منور دکانوں کے سامنے رک کر کھرا ہو گیا۔ ٹھیکے دار صاب چلنا ہے تو آ جاؤ! اور یاسین نے یہ حد الگانے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔ سید صاب ٹھیکیدار صاب اپنے ہی آدمی ہیں بخالوں۔
ہاں پاں بخالو۔

ٹھیکیدار صاب نے جلدی سے پان گلوامنڈ میں رکھا اور لپک کر تانگ کی اگلی سیٹ پر آئی۔ تانگہ چلنے کو تھا کہ اوورکوٹ پہنے ہوئے ایک شخص خاموشی سے آیا چھرے؟

ہاں جی! اوورکوٹ والے شخص نے اعتماد سے قدم اٹھایا اور پھیلی نشست پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

ٹھیکیدار جی پاکستان اب کیا کرے گا؟ یاسین نے تانگہ ہاکتے ہی سوال کر دیا۔ پاکستان کیا کرے گا کیا کرتا؟ جی میں یہ کہوں ہوں کہ امریکہ تو تری دے گیا، اب پاکستان کیا کرے گا۔
اچھا اچھا۔ ہاں۔

ٹھیکیدار صابر کے کچھ کھکارے، مگر یاسین نے ان کے جواب کا مزید انتظار نہیں کیا فوراً اس کی طرف مقاطب ہوا۔ سید صاب آپ تو اخبار میں کام کریں ہیں ایک بات بتائیں اگر امریکہ اور روں میں مچھلا ہو گیا تو کون کرے گا؟

ٹھیکیدار صاحب نے اس سوال کے جواب کی ذمہ داری اپنے سرلی اور بولے امریکہ مارے ہی مارے۔

سوچنے کی بات ہے، یا میں نے قتوطیت آئیں لیجی میں کہا۔

میاں ہم نے بھی سوچ کے بات کی ہے یہ اگر زیماں کا یار ایسا دانہ ڈالتا ہے کہ پھوٹ پڑے ہی پڑے اور انگریز امریکہ کی طرف ہے۔

ٹھیکیدار صاحب، یا میں نے نہایت سنجیدگی سے اپنی رائے کا اعلان کیا۔ میرا یہ دھیان پڑے ہے کہ یہ سب اڑنے کی بات ہے۔ روس اگر امریکہ کے اڑنے میں آگیا تو امریکہ سرمے کی طرح یوں پیس ڈالے گا اور اگر یا میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ امریکہ کے روس کے اڑنے میں آگیا تو یہ سمجھ لو ٹھیکیدار جی کہ وہ امریکہ کو چورن بنا کے چاث جاوے گا۔

سب اڑنے کی بات ہے اس نے سوچا کوئی ضعیف نہیں ہے، کوئی قوی نہیں ہے سوال یہ ہے کہ کون کس کے اڑنے میں آئے گا؟ اور تم کس کے اڑنے میں ہیں؟

گھوڑی چلتے چلتے اڑ گئی۔ اس نے اسے بہت ہندری سید کے گرد وہ آگے چلتے کی سمجھا۔ اپنے مقام پر کھڑی کو دنے لگی جیسے ابھی الٹ ہو جائے گی۔ جب یا میں تاگد سے اتر گا ممکن کہ تھوڑی دور جلا پھر اچک کرتا تاگد کے ہم بیٹھ کر اعتماد سے آخری ہندری سید کیا اور گھوڑی معمول کے مطابق چلتے لگی۔

کیوں بھائی، ٹھیکیدار صاحب نے کچھ بیزاری کے سے لجھے میں کہا۔ آج تیرا گھوڑا بہت اڑ رہا ہے۔

اجی میرا گھوڑا کہاں ہے، میرا گھوڑا کبھی از اتحادی یونی گھوڑی ہے۔

گھوڑا کہاں گیا؟

گھوڑا! وہ تلخ ہی فہی ہنا، کیا بتاؤں جی میرا ایک شہردار تھا۔ سلاکرا پنجی سے آیا تھا۔ ایک منیے میرے ساتھ ریا اور سلا گھوڑا لے کے غائب ہو گیا۔

یہ کمال ہوا۔

بس بھی کمال ہی ہو رہا ہے آج کل تو اس نے ٹھنڈا سانس بھرا تھی میں کرائی گیا تھا۔ سب میرے ساتھ کے آڑی وہیں ہیں تھی۔ میں نے ان سے کیا کہ تم وال پتو ایسے نہیں تھے یا ان آکے کیا وحدنا شروع کر دیا۔ انہوں نے میرے سر پر چپت ماری اور کیا کہ پے پر کراچی ہے۔ ٹھیکیدار صاحب میں یہ سوچوں ہوں کہ کراچی میں جا کے آدمی کو کیا ہو جاوے ہے۔

ٹھیکیدار صاحب نے اٹیمنا سے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر کہنے لگے میاں کراچی کی مت پوچھو داں سب چلتا ہے۔

پرٹھیکیدار صاحب یا میں نے کہا چیز کی بات کا تھے ہوئے اپنا بھولا سوال انھیا میں یہ پوچھوں ہوں کہ داتا صاحب کے میتارکس نے گرانے۔

ٹھیکیدار صاحب نے زور سے ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئے پھر ان کی گردون جھک گئی۔ وہ منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے اور ان کے جسم میں ہلاکا سارہ شہ پیدا ہو چلا تھا۔ پھر ان کی آواز کسی قدر بلند ہوئی مگر بلند ہونے پر بھی وہ بہت دھیتی تھی وہ اپنی لرزتی کا نیتی آواز میں گلستانہ ہے تھے۔

سُجَّعْ بَشْ فِيضْ عَالِمْ مُظَهَّرْ نُورْ خَدا
نَاقْصَانْ رَا بَرْ كَاملْ كَمالْ رَا رَهْ نَما

اور گلستانے گلستانے ان کی آواز بھرائی گئی اور وہ چپ ہو گئے۔

تاگنہ مرنگ چوکنگی سے بہت آگے کلکل آیا تھا۔ کچھ خاموشی کچھ اندر ہیرا جہاں تباہ کھڑے ہوئے سپاہی کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا جیسے سور ہا ہے اور چل رہا ہے کوئی چپ چاپ کھڑا ہوا جیسے چلتے چلتے سو گیا ہے۔ یا میں نے فضا کی خاموشی سے پورا فائدہ انھیا یا شاید اس خاموشی میں اس کا دم التئے کا تھا۔ اس نے چاک کو تیز دوڑتے پہنچ کی تبلیوب پنکادیا اور اس سے ایک تیزی آواز پیدا ہوتی چلی گئی۔ پھر اس نے یہاں کا یک گانا شروع کر دیا۔

عَاشْ تَامِرَادْ كُو لَازِمْ هُبْ يَدْعَا كَرْهْ
جَسْ نَهْ دِيَا هُبْ درْ دَلْ اسْ كَا خَدا بَجَلَ كَرْهْ
گُمْ مَقْهَانْ ٹھِیکِیدَار صَاحَبْ يَسِنْ كَرْ جَاَگْ سَے پُرے اماں بہت پر انار لیکارڈ لگا یا تمْ نَهْ۔

یا میں نے پھر ری لی۔ ٹھیکیدار صاحب یہ غزل اتنا گا دیوے تو اس کا چیزی کاغلام بن جاؤں۔

اماں چھوڑ لاتا کی بات۔ کجھن یاد ہے جھبیں۔
کجھن بائی یا میں تازہ دم ہو بیٹھا۔ وہ تاگنہ کے ہم سے انھا اور سیست پر ٹھیکیدار صاحب کے برادر آ بیٹھا۔ بڑی سُخے والی عورت تھی تھی، لات سالی کیا کھا کے اس کا مقابلہ کرے گی۔

ٹھیکیدار صاحب نے کجھن بائی کی آواز پر بات اس طرح شروع کی تھی کہ یہ کسی لمبی داستان کا آغاز ہے۔ مگر ابھی انہوں نے فقرہ پورا ہی کیا تھا کہ اچھرہ موڑ آ گیا۔ ٹھیکیدار صاحب جھبٹ پٹھ تاگنہ سے اترے اور یا میں کی طرف رُخ کئے بغیر سامنے والی چائے کی

دکان پر ہوئے۔

ٹھیکیدار صاحب کو اتار کر یاسین نے اور کوٹ والی سواری کی طرف سوالی نظروں سے دیکھا اور کوٹ والے جواب میں کہا آگے اور اور کوٹ کے اندر مند دے کر خاموش ہو گیا۔ یاسین نے باغ اٹھائی اور تاگل ہاٹک دیا۔ اچھرہ موڑ سے آگے نکل کر یاسین بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ وہ اور اور کوٹ والا پہلے ہی سے خاموش تھے۔ اس وقت پتہ چلا کہ سردی اچھی خاصی ہے اور کہر سڑک پر دور تک تھنڈے دھونکیں کی طریقہ ادا ہو اے۔ اچھرہ تھانے سے تھوڑا آگے نکل کر اور کوٹ والے نے آہستہ سے گر رعب دار آوازیں کہا رکھو۔ تاگل رکھو اس نے جیب سے پمپے نکال یاسین کے ہاتھ پر رکھے اور خاموشی سے اتر گیا۔ چار قدم وہ سڑک پر چلا پھر کچھ میں اتر گیا جہاں اچھا خاصاً اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں چلتا ہوا اور تھوڑی دور دکھائی دیا پھر نظروں سے اوچبل ہو گیا۔ سید صاب یاسین کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
ہوں۔
یہ آدمی کون تھا؟
کیا خبر کون تھا؟ یہ تم جانو۔
مجھے کچھ سوچتے ہے۔
کیا شک?
یاسین نے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ایک اور سوال کھڑا کر دیا۔ سید صاب آپ نے اس کی صورت دیکھی تھی؟
نہیں۔
اور میں نے مجھی نہیں دیکھی۔
یاسین پھر چپ ہو گیا تھوڑی اچھی خاصی رفتار سے چل رہی تھی۔ اسے چاک مارنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے پھر سوال کیا۔
تھی آپ نے اسے بالکل نہیں دیکھا؟
دیکھا ہو گا، مگر میں نے دھیان نہیں دیا۔
بس تھی میرے ساتھ ہوئی اور جی وہ سارے رستے بولا ہی نہیں جانے کون تھا؟ یاسین چپ ہوا اور پھر بولا۔ سید صاب جب وہ

مجھے پیسے دینے کا تو میں نے دیکھا یہ براہاتھ بھائی کا سا کان، میں ڈر گیا تھی یا میں کی آواز دھی ہوتے ہو تے سرگوشی بن گئی جانے کوں تھا۔

یاسین خاموش ہو گیا اور دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے غصہ اس انس بھرا اور کہا سید صاب آدمی سالے کا کچھ پڑھنیں۔ کیا پڑھ کون کیا ہے؟ جبھی تو میں کوئی اچنی سواری نہیں لیتا، وہ رکا، پھر بولا میں نے عورت کی سواری نہیں بخانی تھی؟ بات یہ ہے کہ سید صاب کہ عورت کی سواری رات کو تو میں بالکل نہیں بخانتا۔

کیوں؟

نہیں سید صاب وہ رکا پھر کہنے لگا۔ سید صاب زمانہ بہت برآ گیا ہے کل کی سنوی میں میکلوڈ روڈ پکھڑا تھا ایک جنگل میں سوت ہوت ڈائٹے آیا۔ میں نے کہ لے بے یاسین سواری مل گئی مگر جی وہ پچکے سے بولا مال ملے گا میں بہت کھیانا پڑا۔ میں نے کہا کہ نہیں با بوصاب میں یہ کام نہیں کرتا۔ خیر جی وہ چلا گیا۔ گھوڑی دیر میں ایک با بوصاب آئے جسمیتے جماعتے تانگہ میں بیٹھ گئے میں نے پوچھا، با بوصاب کدھر؟ وہ نفس پڑا بولا لے چل یا راچنی مرضی سے۔ میں جی تاؤ کھا گیا۔ با بوصاب میں یہ کام نہیں کرتا۔ تانگہ سے اتر جا۔ اس ماں کے یار نے مجھے موٹی ہی گالی دے دی اور اتر کے چلا گیا۔ یاسین نے ایک دم سے چپ سادھلی۔ گھوڑی پر زور سے چاک ر سید کی پھر بڑھ رہا نے لگا۔ سالا بر از مانہ آ گیا۔۔۔۔۔ سید صاب جی تانگہ چلانے کا مزہ نہیں رہا۔ عزت نہ پیر اللہ پاک کی میں تانگہ کبھی نہ جوتا تھا مگر کیا کروں جی، اپنے جانور کو کیسے بھوکا مار دوں؟

اس آخری فقرے پر وہ چونک سا پڑا۔ اس کا ذہن پھر بکھنے لگا۔ کونز کشف انجوب، علی بن عثمان جملانی نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ باحشمت صوفیوں میں سے تھے۔ وہ جنگل سے نکل کر فاقہ کے مارے رستے کی تکلیف اٹھاتے ہوئے کونز کے بازار میں پہنچا تھا پر ان کے ایک چڑیا تھی اور وہ صد اگاتے تھے کون ہے جو اس چڑیا کے والے مجھے کچھ دے؟ کسی نے پوچھا اسے مرد بزرگ تو کیا کہتا ہے؟ تب انہوں نے ایک آہ کھینچی اور یوں گویا ہوئے کہ اے غص پیش کرنے ہے میں کیسے کہوں کہ خدا کے لئے مجھے پکھو دو۔

یاسین نے گھوڑی کو زور سے چاک ر سید کیا اور پھر گانے لگا۔

عاشق نامراد کو لازم ہے یہ دعا کرے
جس نے دیا ہے درد دل اس کا خدا بھلا کرے

اچھرہ ادا اور اس کی آباد کانسیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں، سڑک سنان تھی اور تھوڑی تاریک کہرے میں بھیوں کے قلعے
وہنے لے وہنے لے دکھائی پڑ رہے تھے۔ ایک سائیکل رکشا بھی براہ راست شور کرتی گزری تھی۔ مگر اب وہ دور نکل گئی تھی۔ اس کی آواز
کسی دوسرے شہر سے آتی معلوم ہوتی تھی۔ یا سین گاتے گاتے رکا اور اس سے مخاطب ہوا سید صاب چودھویں صدی آگئی پوچھو کیے؟
وہ ایسے کہ میری اماں کہا کرے تھی کہ چودھویں صدی میں گائے گو بر کھائے گی، بیٹیں بر مانگے گی۔ پر جی اب تو اس سے بھی زیادہ ہو گئی۔
پرسوں رات میں بیٹیں کے اڈے پکھڑا تھا کیا دیکھوں ہوں کہ حرامی بوندی کے تالگہ میں ایک لوٹنڈی یا بیٹھنی ہے۔ بوندی سالا بہت
حرامی ہے میں جی اس لوٹنڈی کو جانے تھا۔ میں اس کی مرتبہ کافی پیچھا کے آیا تھا، پر وہ تالگہ میں بیٹھنی تھی۔ سید صاب میں مر گیا۔ اور اس
غیر نے مصلے پا لیت، آنکھیں بند کر اعلان کیا کہ میں مر گیا اور وہ مر گیا۔

صاب، برازمانہ آگیا اس نے مختلط انس بھرا اور پھر بولنے لگا، کسی کا کوئی اعتبار نہیں، نہ مرد کا نہ عورت کا۔ جس عورت کو دیکھو
چکھل پائی اور یہ سالا مرد سب سالوں کی ناگمیں بکروں کی ہو گئی ہیں۔

اس نے یا سین کی بات سنی کی اور کہا یا سین خال میکوڑ والی سواری نے واقعی تم سے وہی سوال کیا تھا؟
ہاں جی، میں سب سالوں کے اشارے جانوں ہوں۔ اور تم نے سواری کو اتنا رد یا۔
با لکل جی۔

اور اگر وہ بولتے بولتے کھکھا، دم لیا تھوڑا اپنا اور دل گی کے انداز میں کہنے لگا اگر میں وہی سوال کروں؟
یا سین نے ایک دم سے مرکرا سے غور سے دیکھا۔ وہ جبکچہ کیا مگر اسے فوراً خیال آیا کہ اس نے تو مذاق میں یہ سوال کیا تھا اور وہ
ہنسنے لگا یا سین نے اس کے ہنسنے کا مطلق ذوٹ نہیں لیا کہنے لگا۔ سید صاب آپ؟

یا سین خاموش ہو گیا اور اسے یوں لگا کہ اس نے سچ گھنگی یا سین سے یہ سوال کرڑا لاتھا اس کے ماتھے اور گردن پر پیش آگیا۔
نبیں سید صاحب یا سین نے دم لے کر کہا آپ ایسا نہیں کہیں گے۔ وہ کافی پھر بولا نہیں سید صاب آپ مت کہنے ایسا۔
ایک ٹیکی زنائی سے برابر سے گزری کرنی کا لے کلوٹے اور ایک خوش رنگ چہرہ دم پھر کے لئے نظر آیا اور اچھل ہو گیا پھر ٹیکی
دور نکل گئی مگر عقب والی سرخ تھی دیر تک نظر آتی رہی۔ سڑک پھر سنان تھی اور بالکل تاریک ابھی بھلی گئی تھی اور چکتے دکھتے کھبے
ایک دم سے اندر ہے ہو گئے تھے۔

سید صاب یا سین کچھ سوچتے سوچتے آہستہ سے بولا۔ میں تاگنگہ بیٹھ رہا ہوں جی۔

تالگہ نہ رہے ہو؟ کیوں؟

بس جی اپنا جی بھر گیا، اس دھنے سے۔

مگر تم تو جاندھروا لے کو بر اجھلا کہتے تھے کروہ جی چھوڑ گیا۔

ٹھیک ہے جی میں بھی جی چھوڑ گیا پر میں جسکی لیمسن کے بیچے نہیں بجا گوں گا۔

پھر کیا کرو گے؟

کچھ کروں جی پر تالگہ کا دھندا اب نہیں چلتا، سید صاب اور اس نے بات کو مزید طول دینے کی بجائے گھوڑی کو تھوڑا بھر گا تا شروع کر دیا۔

عاشق نامراہ کو لازم ہے یہ دعا کرے
اے جی جس نے دیا ہے درد دل اس کا خدا بھلا کرے

گا تے گا تے وہ دفعتار کا سید صاب وہ آدمی کون تھا؟

کون؟ اس نے بے دھیانی میں پوچھا

وہی جی اور کوٹ والا کچھ بھجھ میں نہیں آئی جی میرے کون آدمی تھا وہ؟
ہو گا کوئی آدمی۔

پر کون آدمی تھا؟ وہ پھر سے حیرانی میں ڈوب گیا۔ آدمی سالا بہت کتی چیز ہے۔ کچھ پوچھ نہیں چلتا۔ کون کیا ہے آپ کو کیا پڑ کر میں کون ہوں اور جی مجھے کیا پڑ کر آپ کون ہیں۔

گھوڑی چلتے چلتے پھر اڑ کر کھڑی ہو گئی۔ یاسین نے اسے ہنڑما رے پھر پکارا پھر گالی دی، گھوڑی اُس سے مس نہ ہوئی۔

سید صاب وہ جیز اری سے بولا یہ گھوڑی آگے نہیں جائے گی اور میرا جی بر اہورہ ہے۔

کوئی بات نہیں، وہ تالگہ سے اترتے ہوئے کہنے لگا، یاں سے تو ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں۔ فاصلہ ہی کتنا ہے۔

یاسین نے تالگہ موڑا اور رحمان پورہ کی سمت ہو لیا۔

تحوڑی دور وہ بے سوچے سچے پیدل چلتا رہا۔ یاسین کے بہت سے فقرے اس کے ذہن میں اس طرح گونج رہے تھے جیسے اس

کے اندر کوئی بلوہ ہو گیا ہو یا جیسے تالگہ سڑک پر چلتے چلتے کچھ میں اتر گیا ہو اور سارا راستہ اڑتی ہوئی گرد میں چھپ گیا ہو رفتہ رفتہ یہ گرد

خود ہی بیٹھ گئی۔ نہ کوئی کوئی فقرہ یاد آتا اور اسے پکڑ لیتا۔ نہیں سید صاب آپ نہیں کہیں گے؟ اور اسے یاد آیا کہ یہ کہتے کہتے یا سین کتنا سمجھدے ہو گیا تھا تو کیا اس نے سمجھدی گی سے یا سین سے سوال کیا تھا وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ شاید اس نے سمجھدی گی سے یہ سوال کیا تھا ورنہ یہ بات اس کی زبان پر آتی کیوں؟ مگر شاید یہ اتفاق تھا کہ اس کی زبان پر ایک فقرہ آ گیا۔ وہ دیر تک ایک ناخن گوارا اور ویزش میں بنتا رہا اور فیصلہ کر سکا کہ اس نے سوال سمجھدی گی سے کیا تھا یا سمجھدی گی سے نہیں کیا تھا، نہیں یہ بات محض دل الگی میں کہی گئی تھی اس نے تمکہ پا کر فیصلہ کرنے اندراز میں سوچا اور اس خیال کو ذہن سے بالکل دفع کر دیا۔

خیال کردہ ہن سے بالکل دفع ہو گیا تھا۔ آدمیوں کی صورت واپس آیا۔ وہ آدمی جس نے تانگہ کے برابر آ کر مال کا سوال کیا اور واپس چلا گیا۔ وہ آدمی جو تانگہ میں بیٹھا اور کامی دے کر اتر گیا، ان آدمیوں کے متعلق اسے یونہی تجسس سا ہوا کہ کون تھے وہ اور جب وہ ان کے متعلق سوچ رہا تھا تو اسے اچانک اور کوٹ والا آدمی یاد آ گیا، کون تھا وہ؟ اس سوال نے ایک حرث بن کر اسے آ لیا۔ جب یا سین نے یہ سوال اٹھایا تھا تو وہ بالکل بے تعقل رہا تھا لیکن اب اس سوال نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ کون تھا وہ؟ اس کی صورت کو دھیان میں لانے کی بہت کوشش کی گئی اسے یاد آیا کہ وہ تو اور کوٹ کے اوپنے کار میں گردن سیئنے مند دیئے بیٹھا رہا تھا اور وہ اس کی صورت دیکھ بھی نہیں سکا تھا اور وہ یہ سوچ کر حیران ہوا کہ جائزے کی خاموش راتوں میں کس طرح کوئی ایکیلی سواری تانگہ میں چپ چاپ بیٹھ جاتی ہے اور کسی بھی موڑ پر چپ چاپ اتر جاتی ہے اور پھر وہ کبھی نظر نہیں آتی اور کبھی پیچے نہیں چلتا کہ وہ کس طرف سے آئی تھی اور کس طرف چل گئی۔ سید صاب آپ کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا پتہ کہ آپ کون ہیں عجب بات ہے ہم جان کر بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے جب وہ یوں تھرا تھک کی ایک ہلکی سی روائی اور اس کا دھیان کہیں سے کہیں لے گئی بھبھے کے نیچے کھڑی ہوئی وہ گورت کا چھپہ پہنچتا نہیں چاہتی تھی کون تھی؟ اور سڑک کے کنارے کنارے اندھیرے میں چلتا ہوا دفعہ اسے یا سین کے ٹکوک کا دھیان آیا۔ ان قصور کا جو اس نے سنائے۔ عجب دفعہ ہے عجب طرح کے قصے سناتا ہے کہتا ہے کہ ادھر کا ہوں کدھر کا؟ اور اسے اپنی بے دھیانی کا خیال آیا کہ اس نے کبھی اس سے نہ پوچھا کہ وہ کس شہر سے آیا ہے اور کب آیا ہے۔ پھر اس نے یونہی سوچا کہ آخر مجھ سے یہ کب پر اٹکاف ہوا کہ میں رخصت کے وقت ریستوران کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور کوئی دوسری سواری نہیں کرنے دیتا۔ اسے کچھ یاد نہ آیا اور وہ یہ سوچ کر حیران ہوا کہ اس نے مجھے کیسے جانا اور میں نے اسے کیسے جانا۔ آپ کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا پتہ کہ آپ کون ہیں؟ وہ حلٹے حلٹے ٹکک گیا میں کون ہوں؟

میں کون ہوں؟ اس سوال نے اسے بہت گزردا یا۔ اس نے یہ ملے کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ کون ہے لیکن وہ یہ ملے نہ کر سکا

کہ وہ کون ہے۔ اور اسے شک ہوا کہ اسے اپنے بارے میں کچھ اسی قسم کا شک ہو چلا ہے جو اسے یاسین کے بارے میں اور یا یاسین کو دوسروں کے بارے میں چلا آتا ہے اس شک کے جھیلے کو اس نے ایک ہی وار میں توڑا۔ اس نے ایک بھی ہی جاہنی لی اور دل میں کھا کر میں جو کوئی بھی ہوں بہر حال میں ہوں اسے دفعتاً احساس ہوا کہ اس نے کوئی بہت بڑا دعویٰ کردا ہے اور یہ احساس ہوتے ہی اس کا دعویٰ ایک شک بھرے سوال میں پدل گیا کیا میں حق تھے ہوں؟ پھر اس سوال نے ایک اور قلابازی کھاتی اور یوں کھڑا ہوا تو کیا میں نہیں ہوں؟ سوال یہ ہے کہ میں ہوں یا میں نہیں ہوں؟ سوال یہ ہے کہ میں ہوں اور تو کیوں ہوں اور نہیں ہوں تو کیے نہیں ہوں اور سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی ہو اور پچھرنا ہو۔ سوالوں کے اس نزد میں گھر اگھرا وہ اس لمح میں پھٹک گیا جب وہ اب سے برس بھر پہلے اسی سڑک پر سکوڑ سے گرا تھا۔ جب وہ اخایا گیا تو اس نے تجوب سے یہ خبر سنی کہ وہ سکوڑ سے گر پڑا تھا۔ کب اور کیسے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ یاد کیا۔ آدمی جب گرتا ہے تو اسے مطلق اطلاع نہیں ہوتی کہ وہ گر گیا ہے۔ یہ سوچ کر اسے کسی قدر تجوب ہوا اور اس نے اس لمح کو پھر سے یاد کیا۔ جب وہ لوگوں کے کہنے شنے پر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیونکر گرا تھا۔ اس نے اپنی گری ہوئی حالت کو وہیان میں لانے کی سخت کوشش کی۔ مگر اس حالت کی کوئی تفصیل اس کے وہیان میں نہیں آئی۔ بس یوں لگا جیسے وہ ان لمحوں میں تھا ہی نہیں جیسے وہ تھا اور پھر نہیں رہا تھا اور اب میں ہوں! اس نے ہمدردی کرتے ہوئے مجھ کیدرمیان کھڑے کھڑے سوچا اور اسے یوں لگا جیسے وہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اور یہ خیال کر کے وہ ڈارا کشا یہ وہ شر ہے اور اس نے اپنے سارے حافظہ کو اپنے ارادے کو اپنی مدد کے لئے بڑا یا اور اپنی پوری قوت فکر کے ساتھ اپنے وجود کو محسوں کرنے کی کوشش کی۔ ہم اس نے سوچا اپنی فکر سے اپنے وجود کو محسوں کرتے ہیں میں سوچتا ہوں اس نے میں ہوں اور اس تکلف کے لمح میں اس نے آپ پر لکھا جیر کر کے سوچنا شروع کیا تھا اور ان یادوں کو واپس لانے کی شانی جو یا کیک چڑیوں کی طرح اڑ گئی تھیں اور وہ انہیں ایسے واپس لایا جیسے کھیل سے بھاگے ہوئے پھوپھو سے کسی ایک پچ کو کیپن پکڑ دھکڑا کر کے لائے اور فیلڈ میں کھڑا کر دے پھر دوسرے کو خوشنام کر کے لائے اور پھر پچ کچھ زرد تک پکھو اپنی خوشی سے جمع ہوتے چلے جائیں اور پھر اس نے وارڈ میں مریضوں کے درمیان پڑے پڑے ایک اطمینان کے ساتھ سوچا کہ چونکہ میں یادیں رکھتا ہوں اس نے میں ہوں اور اس لمح اس نیم تاریک خاموش سڑک پر پہلی چلتے ہوئے اس نے سوچا کہ اگر میں سوچتا بند کر دوں اور یادوں کو مٹتو کر دوں اور اس نے سوچا جیسے وہ نہیں سوچ رہا ہے جیسے وہ نہیں ہے چونکہ میں نہیں سوچتا اور اس نے میں نہیں ہوں اور میں کی قید سے آزاد ہو کر وہ دور دو گیا۔ اس نے اس احتیجی جزیرے میں قدم رکھا اور سوچا کہ یہاں آدم زادوں بستا پہلے اس نے سوروں کی ایک روئڑ دیکھی پھر اسے کہرے ہی کہرے نظر آئے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو کتوں کے درمیان پایا اور ایک

ہرن اسے دیکھ کر روایا اور آدم زادوں کی زبان میں بولا کے بدخت تو جس جزیرے میں ہے یہاں ایک ساحرہ حکومت کرتی ہے۔ آدی اس کی محل سرائیں جاتا ہے اور جانور ہن کر جاتا ہے اور یہ سب پہلے آدمی تھے پھر سور اور کترے بن گئے اور مجھ پر اس نے رحم کیا اور ہرن بنا یا اور اس نے ساحرہ کی محل سرائیں سوروں اور کتوں اور بکروں کے درمیان چلتے ہوئے اذیت سے سوچا کر میں کب تک اپنے تینیں برقرار کھسکوں گا۔ اس پر ایوب نے اپنی تمثیل بڑھائی اور کہا قسم زندہ خدا کی جس نے میرا حق لے لیا اور قسم قادر مطلق کی جس نے میری جان کو کلپایا میں اٹھوں کا بھائی اور شتر مرغوں کا ہم نقشیں ہوا بعد اس کے ایوب نے اپنا منہ کھولا اور اپنے دن پر لعنت کی۔ تابود ہو وہ دون جس میں پیدا ہوا اور وہ رات جس رات میں کہتے تھے کہ ایک لڑکا پیٹ میں پڑا اور اس رات چونگ زدنے خواب دیکھا کہ وہ بھی بن گیا ہے وہ صحیح جاگا تو سخت حیران ہوا کہ کیا وہ حقیقی بھی بن گیا ہے اور وہ عمر بھر یہ طے نہ کر سکا کہ آیا وہ آدمی ہے یا کبھی ہے اور سالا مرد ان سب سالوں کی نالگینیں بکروں کی ہیں اس یاد کے ساتھ وہ واپس آیا اپنے میں کے اندر اور اسے یاد آیا وہ شخص جس نے یاسین سے مال کا سوال کیا اور ما بیس گیا۔ وہ شخص جو تانگہ میں بیٹھا کرتا تانگہ سے کہیں لے جائے اور پھر وہ گالی دے کر اتر گیا اب اس نے بڑے درد کے ساتھ کہ اس ورود میں احساس برتری بھی شامل تھا سوچا کر میں ان کے درمیان کب تک اپنے آپ کو برقرار کھسکوں گا۔ احساس برتری سے معمور اس درونے اسے بہت تسلیم بخشی۔ اس نے ایک پراعتماد مظلومانہ شان کے ساتھ سوچنا شروع کیا رات کے پراسرار مسافروں کے بارے میں دن وہاڑے اپنا سب کچھ باہر لے آئے والوں کے بارے میں یاسین کے بارے میں جاندھڑا لے کے بارے میں اور اس نے ان میں سے کسی کے بارے میں نظرت و تھارت کے احساس کے ساتھ اور کسی لئے میں ہوں چکر دی اور انہیں کے ساتھ سوچا اور اس نے سوچا کہ چکر میں محوس کرتا ہوں اس لئے میں ہوں اور اس نے محوس کیا اور اپنے دن پر لعنت کی اس نے ان زندہ خداوں پر جنہوں نے اس کا حق لیا اور اس کی جان کو کلپایا۔ ان شتر مرغوں اور اٹھوں پر جو اس کے بھائی اور ہمنشین ہوئے ترس کھایا اس نے اس ترسنده ہرن پر جو اس کے لئے رویا تو میں محوس کرتا ہوں اس لئے میں ہوں گھر میں اسی گھری اس کے دماغ کے اندر اس کے اپنے کہے ہوئے لفظ گوئی خیجے لگے لفظ جو اس نے یاسین سے کہے اور لفظ جو یاسین نے اس سے کہے۔ حیرت و تجہب سے نکلتا ہوا یاسین اس کی نظروں میں پھر گیا۔ سید صاب آپ اس نے حیران ہو کر سوچا کہ کیا یہ لفظ اسی نے کہے تھے اور سوچنے کے ساتھ اس کا احساس مظلومی پکھڑ جیتے گا۔ مگر یہ بات تو اس نے دل لگی میں کسی تھی۔ دل لگی؟ مگر دل لگی کیا ہوتی ہے؟ اس سوال پر وہ سخت گزبر یا اور پھر وہ طے نہ کر سکا کہ وہ لفظ اس نے کچھ کہے تھے یا کچھ نہیں کہے تھے۔ ایک ذہنی گزبر کے تحت وہ چلتا چلا گیا۔ یہ ساری گزبر اس ایک سوال نے پیدا کی تھی کہ وہ لفظ اس نے سنجیگی سے کہے تھے یا دل

گلی میں کہے تھے۔ اس نے بار بار طے کیا کہ وہ لفظ دل گلی میں کہے گئے تھے مگر یہ طے ہوتے ہی دوسرا سوال سامنے آ کھڑا ہوتا، دل گلی کیا ہوتی ہے؟ اور تم اپنے آپ کو باہر کب لاتے ہیں۔ اس وقت جب سمجھدے ہوتے ہیں یا اس وقت جب دل گلی کرتے ہیں؟ اور اس عالم میں اس نے بڑے رنگ کے ساتھ یا میں کو یاد کیا، کبھی دم کے دم فیصلہ کروڑا تھے کبھی عورت کے پیور دیکھ کر، کبھی مرد کی نانگیں دیکھ کر اور اس کے لب پر آنے والے سوال اتنے سیدھے ہوتے ہیں کہ خود ہی اپنا جواب بن جاتے ہیں۔ ایک کہتے نے لیٹے لیٹے اسے اپنی کنٹ کی گولیوں ایسی آنکھوں سے گھوکر دیکھا۔ پہلے وہ اسی طرح لیٹے ہوئے گھوکتار ہا غرما تار ہا پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ جیسے ابھی وہ اس پر ٹوٹ پڑے گا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹا گیری تو خود اس کی کلی تھی۔ وہ سرک سے نیچے اتر آیا تھا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا اور اسے پہلے تجھ ہوا پھر غصہ آیا کہ کبھی روز اسے اس وقت آتے دیکھتا ہے اور آج اسے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا اس نے اسے سختی سے جھوڑ کی دی اور اپنے دروازے کی طرف بڑھ گیا کہا چیخھے ہٹا گھر پھر بھونکتا ہوا تیزی سے اس کی طرف پکا۔ اس نے کھڑے ہو کر پھر اسے جھوڑ کا کتا پیچھے بہت گیا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے گھر پر دستک دی۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر بجلی جلانی، صبح کے آئے ہوئے کئی بخط پڑے تھے۔ انہیں کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس نے کسی قدر چوتھتے ہوئے مزکر دیکھا ایک بیلی آہستہ سے کمرے میں چلی آئی تھی مغرب وہ دروازے کے قریب ٹھکلی ہوئی تھی اور اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے اسے تک دی تھی۔ ”بہت“ اس نے بیلی کو دیکھ کر کھاتے ہی وہ اس طرح علی چیزیں دی ہیں کبھی تھی ہی نہیں اور اس نے اٹیٹیان سے اخبار اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے آج صبح بہت رواداری میں اخبار دیکھا تھا۔ اب جو پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں میں غنوجگی ہی آنے لگی اسے خیال آیا کہ اچھی خاصی رات گزر گئی ہے۔ سونا چاہیے، تب اس نے اخبار بند کر ایک طرف ڈالا اور کپڑے بدلتے کی تیزی سے پچھلے کمرے میں چلا گیا۔

پچھلے کمرے میں جا کر جہاں روشنی خاصی مضمون تھی۔ اس نے کپڑے بدلتے بدلتے اپنی بہنہ ناگلوں پر نظر ڈالی اور کسی قدر نہ لٹکا۔ اس نے تھوڑے تھوڑے ساتھ پھر اپنی بہنہ ناگلوں کو دیکھا گروہ ٹھک بس تھک ہی رہا۔ وہ یہ طے نہ کر سکا کہ یہ بہنہ ناگیں اس کی اپنی ناگیں ہیں یا کمرے کی؟



سینڈ راؤنڈ

چلتے چلتے اسے دوبارستہ سے ہٹ کر چلنا پڑا۔ دونوں بار ان قطار درقطار کارروائی کے لئے جن کے لئے آگے پھولوں سے لدی ہوئی کارچی اور پیچھے پیچھے کچھ میلی کچھ مرداں کچھ نوسانی صورتوں سے بھری ہوئی کاریں اور پھر وہ اس کوٹھی کے سامنے سے گزر جس کے دروازے پر ایک سرخ پتی پر Welcome لکھا ہوا تھا۔ باہر پھکتی دیکھتی کاریں ایک دوسرے میں ٹھنڈی ٹھنڈاتی کھڑی ہو گیں اندر شامیانہ تباہ ہو اور خخت رنگ برجنگ قنقوں سے لدے ہوئے اور ابھی ابھی وہ اپنے گھر سے چلا آ رہا تھا جہاں چھوٹے بڑے گرام بحث کر رہے تھے کہ جنگ ہو کر رہے گی۔ ابھی ابھی بڑے ابانتے دیوان حافظہ سے قالی تھی اور اعلان کیا تھا کہ جنگ ہو گی۔ آگے کیا ہو گایہ اللہ ہبھر جانتا ہے۔

وہ میں بتاتا ہوں پیچا میاں کہ اب تک کرسی کی پشت سے تیک لگائے بیٹھے تھے۔ سنبھل کر بیٹھے گئے۔ ضرور بتاؤ بڑے ابانتے دیوان حافظہ بند کر کے ایک طرف رکھا اور عینک اتار کر کیس میں رکھنے لگے۔
بس شامی ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

کیسے؟ بڑے ابا عینک کیس میں رکھتے رکھتے رک گئے۔
کیسے کیا؟ بس ہو جائے گا، مگر صرف شامی ہند پر۔ جنوبی ہند کی میں گارنی نہیں لیتا۔
کیسے ہو جائے گا؟ کوئی ثبوت؟

ثبوت پیچا میاں نے بڑے ابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا شاہ فتح اللہ ولی کی چیشین گوئی۔
بڑے ابا سوچ میں پڑ گئے تال کیا، پھر بولے انہوں نے یہ لکھا ہے۔
صف لکھا ہے جی۔

بڑے ابا پھر سوچ میں پڑ گئے آخراں انہوں نے بند کئے ہوئے کیس کو پھر کھولا عینک لگائی اور دیوان حافظہ اٹھایا قال دیکھتا ہوں۔

اور اس کا مودعی کچھ یہ تھا کہ دیوان حافظی کی قال اعلان کرتا ہوا سڑک سے گزرے۔ مگر اس لبی اور کشادہ سڑک پر اسے دوبار قطار
قطار کاروں کے لئے سڑک سے اتر کر چلانا پڑا۔ اسے یونہی خیال آیا کہ وہ سڑک پر اسے دوبار قطار درقطار کاروں کے لئے سڑک اتر کر
چلانا پڑا۔ اسے یونہی خیال آیا کہ ابھی تھوڑے دن پہلے اس سڑک کی صورت کیسی ہو گئی تھی اور یہ کاریں کتنی بدلتی بدلی نظر آتی تھیں چونکی
مٹی لہسی ہوئی، چھتوں پر گھاس پھوس ڈھکی ہوئی ہیئت لائتوں پر کالونس پتی ہوئی، سائزن بیٹتا۔ سائزن کے ساتھ یہ لیک کے سپاہی تیزی
سے سینیاں بجاتے اور ہرا دھر لپکتے مٹی سے لپی ہوئی موڑ کاریں رستوں سے اتر کر ٹھہر جاتیں قطار قطار کھڑی نظر آتیں اور سڑک خالی اور
خاموش ہو جاتی اور خاموش سڑک کتنی عجیب لگتی تھی، ساری فضا پر چھائی ہوئی نظر آتی تھی جیسے اسے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
آج وہ ظاہر ہوئی ہے آج ہم اسے دیکھ رہے ہیں اور اب؟ اب سڑک پر ہر سے کتنی مصروف ہو گئی ہے۔ اب پھر سے کاریں کتنی اجلی
ہو گئی ہیں۔ چکتی وکتی کاریں، ایک کے بغل میں دوسری، سرخ پتی اور سنہری ویکلم ایک لمبی کار سے اترنی ہوئی بلکہ زیور اور بھاری
جوڑوں میں ملبوس خواتین، ظاہر پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ اس نے مزکر دیکھا مسعود اور رضا بس شاپ کے قریب کھڑے تھے۔
رک کر کھڑا ہو گیا وہ دونوں قدم مارتے ہوئے آئے تو خالی ہے ناں وقت؟

اور کیا؟

بس پھر چل۔ گردی لے میں چل کر بیٹھتے ہیں، مگر سالی تیکی مل جاتی تو اچھا ہوتا۔

اس وقت یہاں تیکی ملے گی۔ تو پہ کرو۔

چلو پھر پیدل ہی چلتے ہیں۔ کوئی ہمیں گاڑی پکڑنی ہے۔

یاروہ چلتے چلتے بولا۔

آج شادیاں بہت ہو رہی ہیں۔

ہاں بہت بھیڑیں ذبح ہوئی ہیں آج مسعود نے یہ فقرہ بہت گنجیر لچھ میں کہا تھا مگر وہ اور رضا دونوں بنس پڑے۔

پھر رضا کہنے لگا، اصل میں موسم کے انتظار میں شادیاں کی رکی ہوئی تھیں۔ موسم اس برس بدلنے ہی کوئی نہیں کہتا تھا۔ ہر حال اب
موسم بدل گیا۔

اس نے رضا کی طرف دیکھا اور کسی قدر بچھے ہوئے لپچ میں کہا۔ ہاں موسم بدل ہی گیا۔ چپ ہوا پھر بولا کیا خیال ہے یاروہ سیندھ
راوئنہ ہو گا۔

سیکھ بیٹہ؟ مسعود نے بے اختتامی سے کہا۔ لگ تو نہیں۔

ہاں یا رالگل تک پہنچا ایسا ہی ہے۔ اس کا بجھا ہوا بھی اور بجھ گیا۔
کیسے لگتا ہے رضا نے گرم بھی میں سوال کیا۔

مسعود نے لبھ میں تھوڑی طنز پیدا کرتے ہوئے شایتم نے طاہر کی پہلی بات نہیں سنی۔
کون سی پہلی بات۔

یعنی یہ کہ شادیوں کا موسم شروع ہو گیا۔
پھر؟

پھر یہ کہ ماں روڈ کی گشیدہ لڑکی بھی واپس آچکی ہے اور رکشاوں کا میزبانی پھر سے تیز چلنے لگا ہے مطلب یہ ہوا کہ نارمل لاائف
واپس آچکی ہے۔

نارمل لاائف سے تمہاری مراد کیا ہے؟

بھائی نارمل لاائف کی تین نشانیاں ہیں۔ ماں روڈ پر چلتی پھر تی لڑکیاں، رکشاوں کا تیز چلتا ہوا میزبان پلوچیک ایکٹوٹی
اس جواب پر رضا کچھ زیچ ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکالا۔ مسعود اور اس کی طرف بڑھا یا پھر خود ایک
سگریٹ منہ میں لگا کر سلاکا یا۔ پھر بولا کچھ کہتے رہو۔ جنگ ہو گی۔

مسعود بہن پڑا۔ پھر کہتے لگا۔ یار لوگ جذبہ باتی ہو رہے ہیں انہیں پہنچیں ہے کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔

یار معاف کرنا رضانے چک کر کہا پڑھیں بھی نہیں ہے کہ جنگ کیا ہوتی ہے جنگ اور عشق یہ دو مرکے ایسے ہیں کہ نہ شروع
کرنے سے شروع ہوتے ہیں نہ ختم سے ختم ہوتے ہیں۔

خوب؟ مسعود نے طنزیہ انداز میں دادوی۔

مسعود وہ بولا رضاٹھیک کہتا ہے اعلان۔ بیٹک کر دو گزیر فائزہ ہوتا ہیں عشق میں تو نہیں ہوتا۔
جنگ میں بھی ہوتا۔ رضانے جو شیں میں آ کر کہا۔

مسعود نے رضا کی بات کو نظر انداز رکیا اور اس مقاطب ہوا یا رطاہر تو ابھی تک لٹکا ہوا ہے تھم نہیں ہوا بھی؟
ہو بھی گیا اور نہیں بھی ہوا۔

بیارے تو ہی بہت کر اور سینٹر راؤنڈ کرڈ ال۔ کہیں تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو۔
وہ ایک بھجی سی بُشی بنسا اور چپ رہا۔

رضا کا چہرہ تمثانے لگا یا ری چولوگ سک جنتے ہیں یہ میری بھجی میں نہیں آتے پتھریں کس دنیا میں رہتے ہیں۔
وہ چپ ہوا پھر برادر است مسعود سے مخاطب ہوا تم حاذ پر گئے ہو۔
نہیں گیا مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

بہت فرق پڑتا ہے اور رضا کے لہجے میں ایک برتری کا حساس پیدا ہو گیا میں حاذ پر گیا ہوں۔ تم نے سپاہیوں کو نہیں دیکھا ہے میں
نے دیکھا ہے۔

مسعود جواب میں چپ رہا۔ پھر وہ چلتے چلتے کایا مولوی سے سگریٹ تو لیتے چلیں۔ اصل میں دو باتیں کرتے کرتے منزل کے
قریب آگئے اور مولوی کی دکان تو وہ مقام تھی جہاں سے وہ گردیز لے میں آتے جاتے ادباً کر پڑا کرتے تھے۔ وہ باتوں میں اسے
پہنچھے چھوڑ چل جاتے۔ آگے چلتے چلتے وہ پہنچے اور مولوی کی دکان پر آن ڈلتے۔

مولوی، مسعود نے کہا، حساب آج نہیں ہو گا مگر سگریٹ چلے گا کیوں۔

چلے گا جی، مولوی نے قلندر ان شان سے جواب دیا۔

مگر رضا اسی موڑ میں تھا یا میں نے شفقت بلوچ کو دیکھا، عجیب آدمی ہے۔ شفقت بلوچ کو مولوی چوڑکا، شفقت بلوچ کو آپ
نے دیکھا ہے رضا صاحب ہاں۔۔۔ ہاں اس نے برتری کی شان کے ساتھ کہا۔

اس موڑے آدمی نے جس نے شلوار کے ساتھ کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر جناح کیپ منڈگی ہوئی تھی۔ رضا کو فور سے اور کسی قدم
احرام کی نظر وہ سے دیکھا۔ اچھا ہی؟ تو آپ کی شفقت بلوچ سے باتیں بھی ہو گیں۔

مولوی چل میں دھل دیتے ہوئے بولا خواجہ صاحب جی، تسمیہ ہمارے رضا صاحب کو نہیں جانتے، یہ بہت بڑے آدمی ہیں یہ حاذ
دیکھ کے آئے ہیں، اچھا ہی رضا صاحب یہ بتاؤ شفقت بلوچ کیہا کی کی سوچتا ہے۔

بہت عجیب آدمی ہے۔ رضا کہنے لگا، وہ تھیں اس مقام پر لے گیا۔ جہاں عزیز بھٹی کی شہادت ہوئی تھی اس لڑائی کا حال بتانے لگا
استثنے میں ایک جوان آیا اور بولا کہ جائے تیار ہے۔ آپ لوگ اب واپس چلیں۔ ہم واپس چلتے گئے مگر شفقت بلوچ وہیں کھڑا رہا۔ ہم
جھکتے ہم نے کہا، مگر صاحب آپ نہیں چل رہے۔ شفقت بلوچ نے ہمیں فور سے دیکھا اور کہنے لگا کہ یہاں سے واپس جاؤ اس مقام

سے جہاں عزیز بھٹی کا خون بھاہے آپ لوگوں کو واپس جانا ہے۔ آپ واپس جائیں میں تو یہیں کھڑا ہوں۔ ہم اس شخص کی صورت دیکھنے لگے۔

سبحان اللہ خواجہ صاحب نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گئے۔

میں چھبی جوڑیاں بھی گیا تھا۔ اور رضا نے سوال انداز میں کہا۔ معلوم ہے چھبی میں داخل ہوتے ہی پہلے کیا نظر آتا ہے؟ کیا؟ خواجہ صاحب اور مولوی ہمسن گوش ہو گئے۔

قبریں۔

قبریں؟

ہاں قبریں۔ ایک بھی قطار چلی گئی تھی برابر برابر کیس قبریں تھیں یہ بلوچ رجنٹ کے سپاہی تھے۔ مگر یارِ عجب بات ہے۔ اتنی قبریں تھیں اور وہ جگہ قبرستان میں گئی تھیں لگتا تھا کہ میدان جنگ میں کھڑے ہیں۔ ہم نے فاتحہ پڑھی جب فاتحہ پڑھ پکے تو ایک سپاہی ہمارے قریب آیا کہنے لگا کیا خیال ہے آپ شہری بھائیوں کا ہم ان قبروں کو چھوڑ کر واپس آ جائیں۔ یا رمیراجی چاہا کہ میں کچھ کہوں مگر کچھ کہا نہیں گیا میرا کچھ بس کچھ دل بھرا آیا۔ رضا چپ ہو گیا اس کی آنکھیں بھینگنے لگی تھیں۔

تمہوزی دیر تک بالکل خاموشی رہی پھر خواجہ صاحب کی قدر آہستہ بچھ میں بولے۔ بات سمجھی ہے جی قبریں کیسے چھوڑ دیں۔

مولوی نے مجرم جھری لی اور کہا خواجہ صاحب جی لڑائی نہیں رکتی ہو کر رہے گی۔ باشاد کچھ پہنچنے نہیں۔

پہنچنے نہیں جی مولوی شروع ہو گیا بھارت کہتا ہے کہ شیخ ہمارا اٹوٹ اٹگ ہے میں کہوں ہوں کہ دلی ہمارا اٹوٹ اٹگ ہے پوچھو کیسے ایسے کہ اب گنتے جاؤ اس نے الگیوں پر گننا شروع کیا لال قلعہ ایک قطب صاحب کی لاٹھ دو جمع مسجد تین اولیاء صاحب کا مزار چاراب میں پوچھوں ہوں کہ کشمیر میں ان کا کوئی قلعہ مندر کوئی پاٹھ شالا ہے۔

خواجہ صاحب نے مولوی کی بات سنی اور پھر وہ اس سوت بوث والے شخص سے رجوع ہوئے جو ابھی ابھی کار سے بڑے رکھا سے اتراتھا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون کے لئے ابھی ابھی کوکا کولا بھجوایا تھا۔ کیوں جناب خبریں کیا کہتی ہیں جنگ پھر ہو گی؟

سوٹ بوث والے شخص نے ہائل کیا پھر بڑی ممتازت سے بولا بات یہ ہے کہ پان کیسا؟ مولوی نے پان لگاتے لگاتے پوچھا۔

سوٹ بوث والے شخص نے کہا سادہ خوشبوؤں دینا۔

خواجہ صاحب نے بے جھنی سے کپا، ہاں جی۔

سوٹ بوٹ والے شخص نے اسی متنات سے بات پھر شروع کی بات یہ ہے کہ پاکستان بھی جگہ انور ذہبیں کر سکتا۔
جی کیا فرمایا۔ مولوی کا ہاتھ پان لگاتے لگاتے رک گیا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سوٹ بوٹ والے شخص نے پھر اسی متن انداز میں بات کی۔ ایک چھوٹے ملک کے لئے جس کے دسائل
حمد وہ ہوں کسی بڑے ملک سے گلر لینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔

اس ماں کے یار بڑے ملک نے تو ایسی چوٹی کا زور لگایا۔ مگر ہوا کیا، مولوی کامنہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

ہوا کیا؟ سوٹ بوٹ والا شخص نہایت متنات سے مکرا یا مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر، ہر حال اتنا واضح ہے کہ اس جگہ کا اثر تیقائی
منصوبوں پر بہت پڑے گا۔

مولوی نے پان لگاتے لگاتے ہاتھ روکا اور گلے پان کو الگ رکھ پاس کھڑے ہوئے لڑکے کو ڈپٹ کر کہا ابے اولمڈے بیگم
صاحب سے بوال لے کے آ۔ اور دونی تھاں کرسوٹ بوٹ والے شخص کے سامنے رکھ دی۔
میں نے پان بھی مانگا تھا۔

مولوی نے انکی سے سامنے دوسرا فٹ پا تھا پہنچنے ہوئے بنوازی کی طرف اشارہ کیا پان وہاں سے۔
سوٹ بوٹ والے شخص نے کسی قدر برہمی سے دونی انھا کر جیب میں رکھی اور واپس اپنی کار کی طرف چل دیا۔
سٹارٹ ہوتی ہوئی کار کو مولوی دیکھتا رہا۔ جب وہ روانہ ہو گئی تو اس نے بہت غصہ سے کہا امریکہ کا چھو۔

یار شریف آدمی تھا۔ خواجہ صاحب نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

شریف آدمی؟ مولوی نے تھیم سے کھا طاہر صاحب آپ جانتے ہیں اسے؟ نہیں یا رہیں تو نہیں جانتا کون صاحب ہیں۔
خیر ممی پاؤ جی، خواجہ صاحب بولے مولوی تو یہ بتا کر لڑائی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی۔

بتا دوں؟

بتا دے۔

خواجہ صاحب جی رات کو اٹھو چار بجے کے ہوں میں آسمان کو دیکھو جہیں خود پہنچ جائے گا کہ لڑائی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی۔
ہاں یا ریزی زنائی کہہ رہی تھی پر مولوی خواجہ صاحب رکے اور بولے میری زنائی تو بہت ڈری ہوئی ہے۔

مولوی نے سیدھا سوال کیا خواجہ صاحب جی ایک بات بتاؤ پا کستان میں گیوں مبنگا ہوا۔
نہیں۔

پر بھارت میں ہوا یا کہہ دو کہ نہیں ہوا؟
ہوا۔

ہوا کیا جی۔ وال پتوکال پڑ رہا ہے تو مطلب یہ ہے کہ بلا ادھر ٹکنی۔
خواجہ صاحب نے اس بات کو نہیں چھوڑا اور کہا خیر یہ تو دارستارہ ہے مگر وہ کیا تھا یہ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔
کیا؟ مولوی نے سوال کیا۔

باشاؤ جنگ کی تیسری رات تھی۔ کوئی آدمی رات کا وقت کیا دیکھوں ہوں کہ یہ براوشی کا گولہ جیسے آسان میں قدمیں لگلی ہوئی۔
کئی منٹ تک لگی رہی۔ پھر غائب میں اب تک حریان ہوں کہ وہ کیا چیز تھی پر اس رات خواجہ صاحب رک کر بولے۔ توپ بہت چلی
چھت ایسے مل رہی تھی جیسے پچھا باتا ہے۔

مولوی نے بہت غور سے یہ واقعہ سن پھر بولا یہ تو جنگ سے تمدن دن بعد کی بات ہے مگر مجھے تمدن دن پہلے پہلے چل گیا تھا پوچھو کیسے وہ
ایسے کہ خواجہ صاحب جی میں نے خواب دیکھا کہ جیسے شala مار باغ میں آگ لگ گئی ہے جیسے سارا باغ جعل گیا ہو۔ جی پھر وہ آگ
اک دم سے بھگنی اور سارے درخت دیسے کے دیسے ہی میں جب سے حریان ہو رہا ہوں کہ بھجی واد آگ خود ہی بھج گئی اور درخت
سب دیسے ہی مرے ہیں اتنے میں میری آنکھ کھل گئی جی تیسرے دن حملہ ہو گیا۔

خواجہ صاحب حیرت سے سنتے رہے پھر بولے باں صاحب بعض بعض خواب بڑا سچا ہوتا ہے۔

مولوی پھر شروع ہو گیا یہ تو خواب کی بات تھی اب اور سنو۔ بات کرتے کرتے اس نے اسے مسعود اور رضا کو دیکھا۔ باہم ٹھیکین تم
بھی سنو۔ خواجہ صاحب جی میں جگر کی نماز کے بعد ایک وظیفہ پڑھوں ہوں؟ عمر گزر گئی یہ وظیفہ پڑھتے ہوئے پرسوں تسبیح پھیرتے
پھیرتے اونچا آگئی ایسے لگا جیسے کوئی میرے پیچے کھڑا ہے کہ رہا ہے نظام الدین اولیا کے پاس جائیں نے ہر بڑا کھنکھن کوولیں
پیچھے مڑ کے دیکھا کوئی بھی نہیں دیکھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا۔ پس چمکی آتی تھی کہ کوئی کھڑا ہے کہ رہا ہے نظام الدین اولیا کے پاس
جا۔ میں حریان ہوں خواجہ صاحب کہ اس بات کے مانے کیا ہوئے۔

خواجہ صاحب کا سرجک گیا آنکھیں بند ہو گئیں، تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد آنکھیں کوولیں بولیں آج کل کے نوجوانوں

کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔

مولوی بولا نہیں کہتا ہوں کم بخنوں اب تو تم نے آنکھ سے سب کچھ دیکھ لیا اب تو سمجھ لو اب بھی نہیں سمجھتے۔ یہ کہتے کہتے مولوی ان کی خاموشی کھڑی ہوئی ٹوپی کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ کھڑے ہیں ہمارے با بلوگ۔ میری باتوں پر ہنسنے ہیں۔

مسعود نہیں دیا۔ مولوی تو سچا ہے لا کپیشن کا ایک پیکٹ دے دے۔

کپیشن کا پیکٹ لیا تینوں نے سگریٹ سلاکی سگریٹ سلاکاتے سلاکاتے رضا نے اچانک بے چینی کا اظہار کیا۔ یار میں چلا۔ گرینڈ لئیں چلا۔؟ مسعود نے تعجب سے اسے دیکھا۔

یار اب دیر ہو گئی اور مجھے یاد آیا سمجھتے تو اس وقت گھر پہنچنا تھا۔ کچھ مہمان آنے والے تھے بنانے سگریٹ کا ایک کش لیا کہا، اچھا میں چلا اور یہ جاود جا۔

یار میرے خیال میں گرینڈ لے کا پروگرام آج ملتوی کریں اس نے بے دلی سے کہا۔

کیوں سالے تم بھی ٹوٹ رہے ہو؟

ٹوٹنے کی بات نہیں۔ ایک تو رضا چلا گیا پوری کچنی نہیں رہی اور پھر اتنا وفت بیہاں ہم نے گزار دیا۔ اتنی تو دیر ہو گئی اور یار پھر آج کچھ مسعود نہیں بن رہا۔

مسعود کچھ بجھو سا ہو گیا بے دلی سے بولا اچھا، اصل میں ہمیں رستے میں رکنا نہیں چاہیے تھا۔

ہاں وہ اپنے دھنے لبھے میں بولا ہمیں رستے میں رکنا نہیں چاہیے تھا۔

نیکی پھر نہیں ملی تھی اور نیکی کے لئے انہوں نے ایسی خواہش بھی نہیں کی۔ یوں بھی اب سڑک نسبتاً خاموش تھی اور انہیں پیدل چلنے میں ایک لطف آ رہا تھا۔

یار طاہر، مسعود چلتے چلتے بولا تم اس وقت کیا کہدے ہے تھے۔ اب بتاؤ، کیا پھر کچھ۔۔۔۔۔

نہیں یا زورہ بات کا نتے ہوئے بولا وہ تو میں بکواس کر رہا تھا۔ اب کوئی تصدیق نہیں ہے۔ خیر اس نے تو جو کیا وہ کیا مگر، مسعود کہنے کا ایک غلطی تم سے بھی ہوئی ہے۔

کیا؟

تمہیں رستے میں رکنا نہیں چاہیے تھا۔

وہ نہایت بے مزہ سی بُشی بُشی پھر کیا ہو جاتا۔

کچھ بھی ہوتا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آدمی اس رستے پر پڑے ہی نہیں سمجھیے میں نہیں پڑتا۔ سمجھتا ہوں کہ یہ قصہ ہی کو اس ہے لیکن اگر اس رستے پر پڑے تو پھر انہا تک جانا چاہیے۔ چاہے انہام کچھ بھی ہو۔ حق میں رک جانے کے تو کوئی معنی نہیں ہیں۔ آخر عشق اور اعتدال پسندتی میں کیا رشتہ ہے۔

عشق اور جنگ اس نے مسعود کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اپنے اسی طور پر کچھ کہنے لگا۔ یا شاید وہ بات بدلتے کی کوشش کر رہا تھا بات رضا چھپی کہہ گیا عشق اور جنگ۔

دونوں کا حاصل خانہ خانی۔ مسعود نے لکڑا لگایا۔
ہے تو سبی مگر۔
مگر کیا۔

یار پڑے ہے دکھلی بات کیا ہے۔
کیا؟

دکھل کی اصل بات یہ ہے کہ جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے اور عشق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر۔
تو پھر یہی جنگ شروع نہ کرو مگر شروع ہو جاتی ہے لیکن اگر ختم کرنا چاہو تو ختم ہو جاتی ہے۔
اور عشق؟
وہ بھی۔

واثقی؟ مسعود نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

وہ کچھ اکٹھرا سا ہو گیا سوچ میں پڑ گیا پھر بولا یا رکھ پڑے نہیں۔

دونوں خاموش ہو گئے، پھر چلتے چلتے مسعود نے کہا۔ تمہیں ایک خیر سناوں وہ لندن جا رہی ہے۔
بجھے خبر ہے۔

تمہیں افسوس تو ہو گا۔

کس بات کا؟

اس کے چلے جانے گا۔

وہ ہنسا، وہ تو پہلے اسی جا چکی تھی۔

مسعود نے پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ایک بات پوچھوں۔

پوچھو۔

کیا واقعی اب کوئی قصہ نہیں۔

وہ پھر اکھڑ گیا چپ ہوا پھر اکھڑے ہوئے لہجہ میں بولا یار پوچھنیں۔

پھر دونوں چپ ہو گئے چپ چاپ چلتے رہے پھر وہ کہنے لگا۔ یار بات یہ ہے کہ عشق کرنے کو تو کر دو مگر اس کے بعد یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کریں۔ علاقہ فتح ہو جائے تو بہت سی ابھیں مصروف رکھنے کے لئے پیدا ہو جاتی ہیں لیکن علاقہ بھی فتح نہ ہوا اور جنگ بھی ختم ہو جائے یہ بہت بے لطفی کی بات ہے تو ہمارے بڑے ابانتے دیوان حافظ سے صحیح قال نکالی ہے کہ جنگ ہوگی۔

مسعود زور سے ہنسا اور خاموش ہو گیا۔

دونوں درستک خاموش چلتے رہے وہ بی بی اور کشاورہ سڑک جس پر چلتے ہوئے آج اسے دوبار سڑک سے اتر کر چلنا پڑا تھا اس وقت غالی اور پر سکون تھی اس کوٹھی کے سامنے کاروں کی اب وہ قطار نہیں تھی دو تین کاریں کوٹھی کے احاطہ کے اندر کھڑی تھیں اور درختوں میں لمبے پہنچ دے رہے تھے مجھے بھی جنگ کر رہے تھے کوٹھی کے سامنے سڑک بہت روشن نظر آ رہی تھی۔ اس نے چلتے چلتے بغیر کسی تمہید کے کہا یا رنگ لیا ہے۔

کیا؟ مسعود نے سوال کیا۔

یہی کہ جنگ ہو گی یا نہیں ہو گی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔

حافظ شیرازی کی فال کے باوجود؟

حافظ شیرازی کی فال کے باوجود۔

مسعود پھر نہ دیا اور چپ ہو گیا۔

یار مسعود تم پکھو کوٹ نہیں کر رہے۔

کیا کوئٹہ کریں یا رُوہ کسی قدر بیزاری سے بولا اور پھر چپ ہو گیا۔

پھر وہی چپ چپ، خاموش سڑک اور قدموں کی چاپ رنگ برقوں سے جگہ کرتی ہوئی کوئی کوئی کے سامنے کی منور سڑک پیچھے رہ گئی تھی، آگے سڑک خالی اور خاموش تھی اور اندر ہیرے میں تھی اور اسے پھر جگ کے دنوں کی خالی اور خاموش سڑک کا دھیان آگیا مگر اس وقت وہ خالی اور خاموش سڑک کتنی پر وقار آتی تھی اور اس اندر ہیرے میں کتنا ٹکوہ تھا اور اب ایک خالی دو منزلہ بس شور کرتی ہوئی قریب سے گزرتی چلی گئی یا رہیں ٹیکسی لے لینی چاہیے تھی۔

ہاں یا رستہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ گئی تو پیدل ہی تھے۔

مسعود اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس مرتبہ اس نے بہت سمجھی گی سے مسعود کو مقاطب کیا ہے۔
ہاں۔

کیا خیال ہے تمہارا جگ ہو گی؟

مسعود سے سچنے لگا پھر بولا بتاؤں اپنا خیال۔

ہاں۔

مسعود کچھ کہتے کہتے چپ ہوا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بڑی بے چارگی کے لہجے میں بولا یا رکچھ پہنچیں چل رہا۔



سویاں

چپ چپ اداں گھومنا شروع کرتی تو مستقل گھومتی رہتی بیندھ جاتی تو بس بیندھی ہی رہتی۔ دیونے اس سے پوچھا کہ اے گھن خوبی! تو کیوں اداں ہے وہ روئی اور بیولی کہ اسکیلے میں مجھے خفثان ہوتا ہے۔ اور دیونے یہ سن کر اس پر ترس کھایا اور چائیوں کا ایک سچھا نکال یہ کہ اس کے حوالے کیا کہ بی بی اس قلعہ میں سات کوٹھری یاں ہیں ہر کوٹھری کی چابی اس سچھے میں ہے تو چپ کوٹھری یوں کوکھونا اور جی بہلا ناساتوں کوٹھری مت کھولنا تو اسے کھولے گی تو اپنے سرخابی لائے گی۔

دیو جب صحیح دم رخصت ہوا تو وہ چائیوں کا سچھا خوش خوش کوٹھری یوں کی ست گنجی جس کوٹھری کوکھولا اس میں ایک نیا عالم نظر آیا، اسکی میں اتنے ہیرے و جواہرات بھرے تھے کہ آنکھوں میں چکا چوندا آتی تھی کسی میں زرق برق پوش کیسی سمجھی تھیں کہ اس نے ہر پوشک پہن کر دیکھی اور اپنے تیسیں چندے آفتاب چندے ماہتاب پایا کسی میں باغ باغچوں کی بہار تھی پھول مبتکتے تھے پرندے چکتے تھے یوں ہر کوٹھری میں اس نے ایک نیا عالم دیکھا اور سرو رہوئی۔

دیو روز صحیح دم رخصت ہو جاتا۔ روزہ وہ چائیوں کا سچھا لے کر کوٹھری یوں کی ست جاتی۔ ایک ایک کوٹھری کو کھوئی نت نئے منظر دیکھتی اور باغ باغ ہو جاتی ایک روز اس کے جی میں آئی کہ ساتوں کوٹھری کو بھی کوئے مگر پھر اسے دیو کی بدایت یا دادا گئی ہوا اور وہ ادھر جاتے جاتے رک گئی۔

پھر یوں ہوا کہ روزہ وہ چپ کوٹھری یاں کھوئی جب ان کی سیر کرچکتی تو اسے ساتوں کوٹھری کا خیال آتا مگر ساتھ ہی اسے دیو کی بدایت کا خیال آ جاتا اور وہ ساتوں کوٹھری کھولنے کے خیال کو رفع دفع کر دیتی کبھی کبھی اس کے قدم واقعی اس طرف اٹھ جاتے مگر پھر جاتے جاتے اسے دیو کا خیال آتا اور وہ پلٹ پڑتی۔

پھر ایسا ہوا کہ پہلی کوٹھری کھولنے کے ساتھ ہی اسے ساتوں کوٹھری کا خیال آ جاتا وہ کوٹھری یاں کھوئی جاتی نئے نئے منظر دیکھتی جاتی مگر ساتوں کوٹھری اس کے تصور میں منڈلاتی رہتی۔ اور یہ نئے نئے منظرا سے پچکے پچکے لگتے مگر دیو نے اسے یہ کوٹھری کھولنے

سے منج کیا تھا۔ سو اس ممانعت کے باعث وہ اسے کھولتے ڈرتی تھی اور ممانعت کے باعث وہ اس کی طرف کھینچتی تھی کہ منوع شے ہمیں ڈرتی بھی ہے اور ہمیں اپنی طرف کھینچتی بھی ہے۔

ڈر اور کشش کے درمیان لگکی شہزادی روز ایک بیزاری کے احساس کے ساتھ چڑھ کوٹھری یاں کھوتی اور ساتویں کوٹھری کے خیال میں غلطان رہتی۔ ساتویں کوٹھری کے خیال نے جو کوٹھریوں کے رنگارنگ مظہروں کو بے رنگ کر دیا تھا، جیسے ان مظہروں کے مقنی کچھ دہ ہوں، جیسے ان مظہروں کے مقنی ساتویں کوٹھری کے اندر بند ہوں اور ساتویں کوٹھری کی چاپی اس کے پاس تھی اور اسے کھولنا اس کے اختیار میں تھا اور چاپیاں تو سب کوٹھریوں کی ہمارے پاس ہی ہوتی ہیں اور انہیں کھولنا ہمارے اختیار میں ہوتا ہے مگر یہ کہ ہم انہیں کھولتے ہی نہیں اور ہمارا اختیار ہماری مجبوری بن جاتا ہے۔ وہ کوٹھری کے دروازے پر جا گھری ہوتی اور سوچتی کہ کوٹھری کو کھلواؤں ایک جی کہتا کہ کوٹھری کھول اور دیکھ کر وہ کیارنگ دکھاتی ہے۔ دوسرا جی کہتا کہ کیوں مفت میں آفت مول لیتی ہے اور جسے منج کیا گیا ہے وہ کر کے کیوں مصیبت میں پختتی ہے۔

کوٹھری کو کھلواؤں یا بند کھلواؤں، روز یہ سوال اسے درپیش ہوتا۔ روز وہ ارٹکاب اور اچتاب کی سرحد پر جا گھری ہوتی اور بغیر کوئی قطعی فیصلہ کئے کوٹھری کے پاس سے سرک آتی۔ اس نے فیصلہ نہیں کیا اور سوال اس کے ساتھ چپک گیا۔ ساتویں کوٹھری سوال بن کر اسے پکارتی۔ وہ اس کی طرف کھینچتی اور اس سے دور بھاگتی جیسے آدمی خرابی کی طرف کھینچتا ہے اور خرابی سے دور بھاگتا ہے مگر اسے تو یوں لگتا تھا جیسے ساتویں کوٹھری اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے وہ قلعہ کے دروازے گوشوں میں نکل جاتی، اپنی خواب گاہ میں چل جاتی اور دروازہ اندر سے بند کر لیتی پر اسے یوں لگتا کہ ساتویں کوٹھری اس کے ساتھ اندر چلی آئی ہے جیسے وہ اس کے ساتھ اندر چلی آئی ہے اور کھلنے کا تقاضا کر رہی ہے۔

ساتویں کوٹھری کو کھلواؤں یا بند کھلواؤں وہ چاپی قفل میں انکاتی اور جبک جاتی قفل کی چاپی تو اسی کے قبضہ میں تھی اور کھولنا نہ کھولنا اس کے اختیار میں تھا اور اختیار کا ہونا بھی کتنی بڑی مصیبت ہے اور مجبوری میں کتنا ان ہے اور اس نے اس دن کو سا جب اس نے دیو سے تمباکی کی مجبوری کا ٹکوہ کیا تھا اور تمباہر پسے نہ رہنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

اس نے اپنی طرف سے کچھ طعنہیں کیا تھا مگر جب وہ پہلی کوٹھری کی طرف چلی تو وہ ساتویں کوٹھری کی طرف جا لگی اور جب اس نے دوسرا کوٹھری کی طرف قدم اٹھا نے تو قدم ساتویں کوٹھری کی طرف اٹھ گئے اور چاپی اس کے اختیار میں تھی اور قدم اس کے اختیار سے باہر تھے۔ سو وہ جب پہلی کوٹھری کی طرف چلی تو اس نے اپنے آپ کو ساتویں کوٹھری کے سامنے پایا اور ساتویں کوٹھری

نے اسے یوں آیا جیسے انہی خواہش آدمی کو آ لیتی ہے اور اس نے قفل میں کنجی یوں ذاتی جیسے آدمی اپنے جذب کے سامنے پر ڈالتا ہے۔

اس نے کوٹھڑی کھوئی اور سخت مالیوں ہوئی دہان تو کچھ بھی نہیں تھا وہاں ایک آدمی مردہ سا پڑا تھا وہ اسے دیکھ کر ڈری اور اٹھ پاؤں چلی مگر پھر اسے کرید ہوئی کہ آخر یہ کون اجتنی ہے یہاں کیسے اور کب پہنچا کیا وہ واقعی مرگیا ہے؟ ان سوالوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا وہ تحفظ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اسے خیال ہوا کہ اس کا سانس دیکھا جائے کہ جل رہا ہے یا نہیں مگر اس کے قریب جاتے جاتے ٹھنک گئی اس سے قریب ہونے کی ہمت نہیں ہوئی مگر اسے تجسس بھی تو تھا کہ وہ واقعی مرگیا ہے یا جیتا ہے سواس نے ڈرتے ڈرتے اس کے تکوے کو چھووا کر کیا تکوہ اس کا گرم ہے۔ اس نے تکوے پر ہاتھ رکھا تو اس کی انگلیاں ایک سوئی پر چاپیں۔ اس نے آہستہ سے سوئی نکالی اور سخت متوجہ ہوئی کہ اس کے تکوے میں سوئی کیوں چھبی ہوئی ہے۔ اسی تجہب میں اس نے پورے تکوے کو ٹولنا اور اس میں جا بجا سوئیاں چھبی ہوئی پائیں۔ اسے اور تجہب ہوا پھر وہ ہاتھ اوپر لے گئی اور ناٹکوں کو ٹولنا ناٹکوں میں بھی سوئیاں چھبی ہوئی تھیں۔ اسے یہ تجہب ہوا اور جنتجو ہوئی کہ سارے بدن کو دیکھوا اس نے سارے بدن کو دیکھا ایک ایک حصہ کو چھووا سارا بدن سوئیوں سے پیندھا تھا۔

اس تجہس اور حیرانی میں شہزادی کا خوف خود بخود جاتا رہا۔ اسے مردہ شخص سے ہمدردی کی ہو گئی بس وہ وہیں اس کے بیرون میں پہنچ گئی اور اس کے تکوہ سے سوئیاں چھپنے لگی۔

وہ تو صرف تکوہ کی سوئیاں نکالنے بیٹھی تھی۔ مگر پھر وہ سوئیاں نکالنے میں اسکی محبوہ ہوئی کو سارے بدن کی سوئیاں نکالتی چلی گئی اور بدن میں بینڈگی سوئی کو نکالنا سخت نازک کام ہوتا ہے اور سخت اذیت دیتا ہے اس کی پوریں چھل چھل گئیں مگر اس کا تجی بے طرح آیا ہوا تھا کہ بیٹھی رہو اور سوئیاں چلتی رہاویے کام بھی ہوتے ہیں جو اذیت بھی دیتے ہیں اور لذت بھی دیتے ہیں۔

سوئیاں چلتے چلتے شہزادی نے سوچا کہ یہ اجتنی تو مرچکا ہے۔ وہ اس کے بدن سے سوئیاں نکال بھی ڈالے گی تو کیا حاصل ہو گا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ بے مقصد کام کیوں کر رہی ہے اس نے یہ سوچا مگر اس کی انگلیاں اسی طرح سوئیاں چھپتی رہیں تجہب بھید بھرا مشغله تھا کہ اس کا کوئی حاصل بھی نظر نہیں آتا تھا اور پھر بھی وہ اس میں تن من سے غرق تھی۔

پھر سوئیاں چلتے چلتے شہزادی نے سوچا کہ آخر یہ اجتنی ہے کون اور اسے اپنی اتنا سے سکی وہ کہانی یاد آ گئی کہ ایک شہزادہ ایک دیوی کی قید میں تھا اور شہزادہ ایک روز اپنے آپ سے بیزار ہو کر دکھ بھری آواز میں چھپتا کر میں اکیلا ہوں تب دیوی نے اس پر ترس کھایا اور

تیرکمان یہ کہ اس کے حوالے کی کہ دیکھ اس قلعہ میں چار گھوٹ ہیں تین گھوٹ جا شکار کھیل اور جی بہلا۔ پر دیکھ چوتھے گھوٹ مت
جائیو کہ ادھر جائے گا تو اپنے سرہلانے گا اور شہزادہ تینوں گھوٹ گیا۔ شکار کھیل اور جی بہلا یا ایک روز اس پر سک سوار ہوئی کہ چوتھے
گھوٹ کی سیر کرو۔ اسے دیوبیکی بدایت یاد آئی مگر جی بہلا یا ایک روز اس پر سک سوار ہوئی کہ آتا ہے اور دماغ کی اوپر کھاڑ
چال ہے کہ جس رستے کو بند کرو اسی پر چلتا ہے اور آنکھ کا عجیب طور ہے کہ جو اچھل ہے اسی کو دیکھنے کی منتظر ہوتی ہے۔ سو شہزادے نے
آؤ دیکھانہ تاڑا چوتھے گھوٹے میں قدم رکھ دیا کیا دیکھا کہ منتظر تک ہر ابھرا باعث پھیلا ہے اور ایک ہر ان کے مانند عورت کے جیں ہے
کلیلیں کرتا پھرتا ہے۔ شہزادہ چلہ میں تیر جوڑ اس کے پیچے ہو لیا تھوڑی دیر میں وہ ہرن غائب ہوا اور باعث ندارہ ہوا۔ نامعلوم ستر
سے ایک آواز آتی تھی آواز والا نظر نہیں آتا تھا۔ شہزادے نے سوچا کہ اس آواز کی تھا دیکھو اور بھیہ معلوم کرو۔ سو وہ اس آواز پر کھنپا
چلا گیا۔ تھوڑا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ آواز بھی غائب ہوئی۔ نہ آدم زادہ نہ چرند پرندہ پھول پتی، سامنے دیر ان تھا اور ایک دریا بہتا
تھا۔ شہزادے کو پیاس گئی۔ تیرکمان ایک طرف رکھ دیا کنارے جا بیٹھا۔ ہاتھ پانی میں ڈالا اور چلوپانی سے بھرا دفٹا کیا دیکھتا ہے کہ وہ
گوری گوری باہیں پانی سے ابھری ہیں اور اس پر پتی ہیں وہ جھگ کر پیچے ہٹا۔ پیچے ہٹنا تھا کہ پتی کھائی اور غش کر گیا۔ جب آنکھ کھلی تو
شہزادہ بیاں پانی سے ابھری ہیں۔ وہ قلعہ میں تھا اور دیوبیوس پر لال پیلا ہو رہا تھا اور دیوبیوس نے اس کے سارے بدن میں سوئیاں گودیں ور
اسے کوٹھری میں ڈال دیا اور شہزادہ نے سوچا کہ کیا یہ وہی شہزادہ ہے اور کیا یہ شہزادہ بھی سوئیاں نکل جانے کے ساتھ جاگ کھڑا ہو گا مگر
اس نے سوچا کہ وہ تو کہانی تھی اور اس کے خیال کے ساتھ اس نے اس کے زندہ ہو جانے کے خیال کو رفع دفع کر دیا۔

لیکن اگر یہ جسم بیٹھ کے لئے سو گیا ہے تو میں اسے کس اذیت سے نجات دالا رہی ہوں اور شہزادہ نے اپنی بیویہاں پوروں پر نظر
ڈالی اور اس کی بکھمیں نہ آیا کہ اس کی اذیت کی منزل کیا ہے اذیت کی منزل اس کی بکھمیں نہ آئی، پھر بھی اس کی اگلیاں سوئیاں
چھتی رہیں اور اس کی پوریں خونم خون ہو گئیں اور پھر اس نے گمان کیا کہ جب یہ سب سوئیاں نکل جائیں گی تو اجنبی چیزاں جاگتا اٹھ کھڑا
ہو گا اور اب اسے یہ گمان کرنے کے ساتھ تھوڑا تھوڑا ہوئی ن شک نے گھرا۔ آپ یہی آپ اسے لیتھن آگیا اور اس نے زیادہ پھرتی
سے سوئیاں چھتی شروع کر دیں وہ اس تصور میں گھن تھی کہ اب سوئیاں نکلیں اور اب اجنبی زندہ ہوا اور اس آن اسے گمان ہوا کہ سوئیاں
اس کے اپنے بدن سے نکل رہی ہیں۔ جب ہم دوسرے کی سوئیاں نکلتے ہیں تو اپنی بھی سوئیاں نکلتے ہیں تو کیا میرے بدن میں
بھی سوئیاں بیندھی تھیں؟ اسے سخت حرمت ہوئی اس نے بہت دھیان کیا کہ سوئیاں کب اور کیسے اس میں پیوست ہو گیں پر اسے کچھ
یاد نہ آیا ہم اپنے اندر سوئیاں بیندھی لئے پھرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ سوئیاں اور کیسے ہم میں ہا گئیں۔

شہزادی نے بدن کی ساری سویاں میں ڈالیں۔ اس کی پوری خون میں ترہ تھیں اور اس کا بدن پھول کی مثال گلگت تھا اور اس نے اجنبی پر سر سے چوتھک نظر ڈالی سر کے سوا سارے بدن کی سویاں جنی گئی تھیں اور بدن میں حرارت کی ایک روروال دوا تھی۔ یہ دیکھ شہزادی خوش ہوئی۔ اس نے سوچا کہ سر کی سویاں جلدی جلدی نکالو کہ کام کا انعام بخیر ہوا اور اجنبی میں جان آئے۔

شہزادی نے سر کی سویاں ترت پھرت چھیں۔ وہ پڑھتے ڈھلتے اس نے سب سویاں نکال ڈالیں۔ اس ایک سوئی پیچ دماغ میں رہ گئی اور شہزادی نے اجنبی کے بیدار ہوتے بدن پر ایک نظر ڈالی اور اپنے آپ پر غور کیا کہ جیسے وہ کھل رہی ہے کہ جیسے اس کے چہ در کھل چکے ہیں اور وہ ساتوں در کی دلیز پر کھڑی ہے، حیران ہیں اور دلیز پر کھڑی رہی پھر آپ ہی آپ اس کے دل میں ایک ڈر ساتا چلا گیا۔ اس نے بیدار ہوتے اجنبی کوڑی ڈری نظروں سے دیکھا اور اپنے کھلتے ہوئے آپے پر غور کیا اور اس نے تشویش سے سوچا کہ وہ دماغ میں پھنسی ہوئی کوٹکالے یا نکالے۔

فیصلہ کی گھڑی اس پر پھر منڈلانے لگی تھی۔ وہ تشویش میں تھی کہ آیا آخری سوئی کہ نکالا جائے وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی بس ایک تمذب میں اس نے سوئی کو پوروں سے پکڑا اور پھر بچھ کر چھوڑ دیا اور بیدار ہوتا اجنبی پھر ساکت ہو گیا۔

شہزادی نے ایک تاسفت کے ساتھ اجنبی کے ساکت جسم کو دیکھا پھر اپنی ابولہان پوروں پر نظر کی میں اسی گھڑی قلعہ کے درو دیوار کا نیچے اور دیگر جاتا دہالتا قلعہ میں داخل ہوا۔ اس نے شہزادی کو ساتوں کوٹھڑی کھولنے کی سزا یہ دی کہ اس پر نوکڑی پانس بر سائے۔ چاہیوں کا کچھ اس سے چھیننا اور ساتوں کوٹھڑیاں بند کر گر جاتا اور برستا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

اس دن کے بعد شہزادی پھر دیران ہو گئی۔ چپ چپ اوس اوس گھومنا شروع کرتی تو پھر کئی کی طرح گھومتی رہتی اور خفافیتی سارے قلعہ میں بھکتی پھر تی بیٹھ جاتی تو بس بیٹھی ہی رہتی اور وہ روئی اور بولی کہ اسکیلے میں میرا جی گھبراتا ہے اور دیو نے اسے انگار آنکھوں سے دیکھا اور روز کی طرح اسے اکیلا چھوڑ، گر جتا برستا براہ رکھ لکھ گیا۔



شہادت

اور جب انہوں نے صحن کے پیچے آگ جلانی اور مل کر بیٹھنے تو پھر ان کے پیچے میں بیٹھ گیا۔ ایک لوگوں نے اسے آگ کی روشنی میں بیٹھا ہوا دیکھ کر اس پر خوب نگاہ کی اور یوں کہا یہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ اسے عورت میں اسے نہیں جانتا۔ بعد تھوڑی دیر کے کسی اور نے اسے دیکھا اور سوال کیا کہ تو بھی انہیں میں سے ہے۔ پھر ان نے کہا میاں میں نہیں ہوں کوئی سمجھنے بھر بھرا دیک اور شخص یعنی کے ساتھ کہنے لگا کہ یہ آدمی بے شک اسی کے ساتھ تھا کیونکہ ممکنی ہے پھر ان نے کہا اے شخص میں نہیں جانتا تو کیا کہتا ہے۔ وہ کہہ دی رہا تھا کہ اسی دم مرغ نے بانگ دی اور خاوند نے پھر کر پھر پھر پر نظر کی اور پھر ان کو خداوند کی وہ بات یاد آئی جو اس سے کہی تھی کہ آج مرغ کے بانگ دینے سے پہلے تو تم بارہ مریا انکار کرے گا اور جب اس نے باہر جا کر غور کیا تو وہ زار زار رویا۔ اس نے ایک بار پھر ڈرتے ڈرتے اڑتی سی نظر سے لاری کی نشتوں کا جائزہ لیا۔ اب اس کے سامنے کی ساری نشیں بھر گئی یعنی اور کھڑکی کے بالکل برابر والی سیٹ پر ایک دراز تدریس کھڑا آس پاس کے مسافروں سے بے تعلق بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ججھ گیا یہ کب لاری میں سوار ہوا تھا؟ اور یہ سب سے الگ تھلک اتنا خاموش کیوں بیٹھا ہے؟

اس نے بناہر بے انتہائی سے ایک مرتبہ پھر اس طرف نظر ڈالی وہ یہ طمیتان کرنا چاہتا تھا کہ کہیں وہ سکھا سے تو نہیں دیکھ رہا۔

چلوں یاں سے۔ ابھی دیر ہے۔

اچھا وہ چونکہ پڑا۔

ہاں شریف نے اسی غبلت سے کہا بارہ بجے سے پہلے ہماری پیشی ہوتی نظر نہیں آتی باہر چلیں یاں بہت گری ہے۔

وہ دونوں آدمیوں سے بھرے ہوئے برآمدے سے کل کر بہر آئے اور بھیڑ کر چرتے ہوئے شریبوں سے بھری اس گاڑی کے پاس پہنچ جہاں کلیم کے ایک دمغزر امیدوار طمیتان سے کھڑے اور جس سکوائش پری رہے تھے۔ یہاں بھی دھوپ آٹھی تھی وہ دو قدم بڑھ کر بس سینیڈ کے سائبان کے نیچے ہوئے شریف اب بھی اسی طرح گھبرا یا ہوا تھا۔ وہ منٹ وہ سائبان کے نیچے کھڑا ہوا پھر بولا۔

یا رقم نہیں رہتا میں ذرا پیش کارے بات کراؤ شاید جلدی کام ہو جائے۔ اور جس عجلت سے وہ باہر لکھا تھا، اسی عجلت سے پھر اندر چلا گیا۔ اس نے طمیان کا سانس لیا اور تصور کے نوٹے ہوئے تار کو پھر جوڑنے کی کوشش کی۔ لیکن برآمدے سے بس شینڈنک آتے آتے۔ دنیا بہت بدل گئی تھی کچھ بنے ہوئے رشتے بکھر گئے تھے۔ بنے رشتے مرتب ہو گئے تھے اور اس کے لئے تصور کو جہاں سے ٹوٹا تھا جوڑ کر اسی طرح جاری رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اس نے سماں کے نیچے کھڑے ٹکم آفس کے برآمدے پر نظر ڈالی۔ اسے تجھ ہونے لگا کہ اس گری میں اس کچھ کچھ بھرے ہوئے برآمدے میں اتنی دیر وہ کیسے کھوار رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پڑا اسی برآمدے سے کسی قدر باہر نکل کر کھڑا ہوتا اور پکارتا، فلاں ولد فلاں حاضر ہے؟ اور کبھی برآمدے سے کسی قدر باہر نکل کھڑا ہوتا اور پکارتا فلاں ولد فلاں حاضر ہے اور کبھی برآمدے ہی میں سے کوئی شخص پاک جھپک اندر جاتا کہی باہر وہ سوپ میں کھڑے ہوئے مجھے سے کوئی جلتا باتا مہا جرگبھرایا ہوا تیزی سے جانا نظر آتا یہ سب صاحب جائیداد تھے وہ حیران ہو کر سوچنے لگا اور وہ خود جو گھیر کے کئی مقدموں میں گواہ بننے کا فخر حاصل کر چکا تھا اس خیال سے وہ افسر وہ ہو گیا جن کے پاس تھا نہیں دیا جائے گا۔

اس کے عقب میں کئی بیس آکر کھڑی ہو گیں اور گزر گئیں اگر اسے شریف نے پاندھ در کھا ہوتا تو اس کے لئے اس وقت بس پکڑنا کتنا آسان تھا اور اس سے اسے اپنی زندگی کی ڈگر بدل جانے کا خیال آیا۔ اس کی زندگی کی ڈگر صرف اس قدر بدی تھی کہ آگے ولاری میں شہر سے شہر تک کا سفر کیا کرتا تھا۔ اب صحن و شام شہر کے اندر بسوں میں چلتا رہتا ہے اور اس نے اپنے بیٹے دنوں پر نظر کی تو وہ لاری کا ایک لمبا سفر نظر آئے۔ یہ سفر آپس میں اتنے گذمہ تھے کہ انہیں الگ الگ یاد نہیں کیا جا سکتا تھا بس اس وقت جانے کیسے اچانک ایک سفر تازہ واردات بن کر زہن میں ابھر آیا تھا۔

وہ دن بقیر عید کا تھا اپکن پیٹے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ آج ہنکلی لاری اسے آسانی سے مل جائے گی آج کون ہی عدالتیں کھلی ہیں جو مقدمہ باگھر سے نہیں گے اور مسلمان تو یوں بھی سفر پر بھی نہیں نہیں نہیں کم از کم نماز سے پہلے تو کسی مسلمان مسافر کی توقع ہو ہی نہیں سکتی یہ سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ مسلمان ان دنوں سفر میں کتنے محتاج ہو گئے ہیں۔ اکیلا اکیلا اسپر اب کون کرتا ہے اور کوئی کرتا بھی ہے تو اس الترام سے کہ اس کی چال ڈھانل اور پہناؤ سے اس کی اصل چھٹلی نہ کھا جائے۔ اس نے اپکن کے ہن بند کے بالوں میں سکھا کیا میز سے رومال اٹھا کر جیب میں رکھا۔ کمرے سے لختے لختے وہ پھر مڑا اور آئینہ میں اپکن کے کارکو دیکھا پھر آئینہ سے بہث کر برادر راست اپکن پر نظر ڈالی وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ضرور ہے کہ بقیر عید کے دن اپکن ہی پہنچی جائے اگر وہ بھلی ہو گئی ہے تو اسے اتار کر پتوں قمیش کیوں نہ چکن لی جائے مگر اسے کہیں بھی داغ و حبہ نظر نہیں آیا اور وہ کمر بند کر کے باہر لکھا سوچنگ نکل آیا تھا مجھ کی

خندک جو ابھی تک فضا میں موجود تھی اب رخصت ہو چلی تھی اور چڑھتی دھوپ کے ساتھ گرفی کم کم پھیل رہی تھی۔ اس نے پھر اپنی اچکن پر نظر کی اور سوچا کہ لا ری میں بیٹھ کر تو اچکن کا حلیہ بگز جائے گا آخہ پتوں میں یہ کیوں نہ چکن لی جائے۔ وہ جلدی سے اندر آیا۔ جلدی جلدی الیاس بدلا اور غمیش پتوں میں ملبوس باہر کل لاری کے اڈے کی طرف چل پڑا۔

اس کا قیاس صحیح تھا۔ اڈے پر خلاف معمول ہجوم بہت کم تھا۔ اگلی سیٹ پر ایک موٹا بیبا اس کے برا بر ایک چھر رے بدن کا غمیش عینک لگائے کھدر کے کرتے پا بجاءے میں ملبوس بیچھے چند جاٹ بیٹھے اونگھر ہے تھے پھر ایک شخص سفید بگا ایسی دھوقی اور لمبے کوٹ میں ملبوس آیا اور چھر رے بدن والے شخص کے پاس بیٹھ گیا اس کے بعد کلیز نے بہت صد ایکس لگائیں مگر کوئی نیا سافر نہ آیا۔ تب وہ لاری کے آگے بچنا اور سامنے والی چائے کی دکان سے نکل کر مستعدی سے اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس ڈرائیور کو دیکھ کر اس کا دل دھک دھک سے رہ گیا۔ وہ تو سکھ ہے اور اس کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا۔ اس لاری سے سفر کرے یا نہ کرے۔ اس نے سترنہ کرنے کے حق میں بڑا معموق اسندال کیا تھا کہ کیا ضرور ہے کہ بقرعید گھر جا کر ہی کی جائے۔ تماز یہاں بھی پڑھی جا سکتی ہے گھر لکھ بھیجنیں گے کہ امتحان سر پر ہے اس لئے میں نہیں آیا مگر اس اسندال کی محتولیت کے باوجود لاری سے اتنے کی اسے ہست نہیں پڑی۔ کئی منٹ تک اس کے دل و دماغ میں خوب جنگ وجہل ہوتی اور آخہ جب لاری سارٹ ہو گئی تو وہ تحک کرتا پر تقدیر بیچھے آرام سے نیک لگا کر بیٹھ گیا۔

لاری راستے میں جا چکار کی اور کہیں سے ایک اور کہیں سے ذر سوار یاں چڑھیں اور جب لاری عین گاہ کے سامنے سے گزر رہی تھی تو بھر چکی تھی سڑک پر اور سڑک سے پرے بنچے بڑے بھر کیلے کپڑے پہنے روائی دوال تھے اور در عین گاہ کے قریب ایک میلہ لگا تھا اور چڑھتی کھانتے والوں سے بھرا چھٹ تیز تیز گردش کر رہا تھا وہ سوچنے لگا کہ وہ ان سے کتنی دور ہے انہیں کیا خبر ہو گئی کہ یاں لاری میں اس سے آگے وہ پکجھنہ سوچ سکا۔

اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ جب وہ لاری میں سفر کر رہا تھا تو ایک بنیاد دیر سک اس سے باتیں کرتا رہا۔ سکول کا حال چال پوچھتا رہا۔ پھر اس نے سوال کیا لالہ تیری گوت کیا ہے؟ اور وہ اک ذرا بھجوکا بھر بولا جی میں مسلمان ہوں اور اگر کسی نے اس وقت اس سے بیکی سوال کروالا تو کیا وہ کہہ سکے گا کہ اور اس خیال سے اسے پیش آ گیا اس نے اردو گرو نظر ڈالی کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اس کے کپڑے سے اتر رہے تھے اور اسے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ سوچ سکا وہ سب پر ظاہر ہو گیا ہے۔ اس وقت اگر لاری رکی ہوئی ہوتی تو وہ یقیناً چھلانگ لگا کر باہر کل جاتا۔ مگر موٹا بیبا اونگھنے لگا تھا اور چھر رے بدن والے نے ہندی کا اخبار کھول کر پڑھنا

شروع کر دیا تھا۔ اس نے پچھے مرکز رکھا۔ میلے کپلے جات آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے اسے اطمینان سا ہو گیا، اب وہ اطمینان سے سوچ سکتا تھا۔

آخرا ری میں چلنے والے مسافروں کو نام اور ذات پوچھنے کا اتنا چکا کیوں ہوتا ہے۔ آخرا نام میں کیا رکھا ہے مگر لاری کے مسافر نام کو بہت کچھ بلکہ سب کچھ سمجھتے ہیں ویسے جب نام میں کچھ رکھا ہی نہیں ہے۔ تو کیا ضرور ہے کہ اس سوال کا سنجیدگی سے جواب دیا جائے کچھ بھی نام بتا دیا تو اس سے اگر یاں کسی نام پوچھا تو کیا اسے اور اس سوال پر رہ گزرنا اگلی۔ اس کے استدلال کی زنجیر الجھ کر ٹوٹ گئی۔ اس نے آس پاس کے مسافروں کو دیکھا۔ کہنیں واقعی اس سے کوئی نام تو نہیں پوچھ لے گا پھر اس نے پچھے مرکز عقلي نشتوں پر نظر ڈالی۔ جات اسی طرح زور زور سے باتیں کے جارہے تے۔ لیکا یہ اس کی نظر کھڑکی کے برابر والی سیٹ پر گئی اور اس کا دلگ دھک سے رہ گیا۔ یہ غصہ کب بیشا؟ کیا اس نے اسے تازیا ہے اس کی نظر اس کے لئے لمبے کیوں اور پھر کرپان پر گئی اور اس نے دیکھا کہ وہ جانوں کی باتوں سے بے تعلق چپ سادھے بیٹھا ہے۔ وہ اتنے پر اسرار طریقے پر کیوں بیٹھا ہے اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اس نے نظر پھیری اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل دھک کئے جا رہا تھا، اس کی پیٹھی میں سوئیاں ہی چھو رہی تھیں۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ اس سکھ مسافر کی نظریں اس کی پشت میں پیوست ہو گئی ہیں اور یہ جات بولتے بولتے کیوں خاموش ہو گئے۔ اس نے مرکز رکھنا چاہا مگر اس کا سارا جسم ان ہو گیا تھا جم گیا تھا اسے یوں لگا کہ سب کچھ سبھر گیا ہے خاموش ہو گیا ہے بس لاری دوزی چلی جا رہی ہے بغیر ڈرائیور کی مدد کے وہ دوزتے دوزتے کسی بہت بڑے کھنڈ میں اتر جائے گی۔

یار حسین یاد ہے نا؟

کیا؟ اس کے تصور کا تار پھر ٹوٹ گیا۔

یار تم وال جا کر بھول جاؤ گے ایک مرتبہ پھر دہرا لو۔

شریف پسند میں شرایور جس گلت سے آیا تھا اسی گلت سے بول رہا تھا میرے والد کا نام ہے قاضی اشرف علی، قاضی واڑہ میں مکان تھا۔ تم نے دیکھا تھا ناچلی بھی تھی پاپ بھی تھا پوچھیں گے مکانیت کیا تھی۔ کہنا چجھ بڑے بڑے کرے کرے تھے دو منزلیں تھیں نام ضرور یا درکھنا قاضی اشرف علی اور میرا پورا نام ہے قاضی محمد شریف، جلدی جلدی کہتا ہوا دی پھر کھیر آفس کی طرف چلا۔ میں آزادے لوں گا ابھی تھوڑی دیر میں ذرا تھوڑا اور کھڑے رہو۔

اس نے دل ہی دل میں شریف کی بتائی تفصیلات ایک بار پھر دہرا میں شریف صحیح کہتا تھا نام اس کے ذہن میں بار بار گھپلا

ہو جاتے تھے۔ آخر نام اس کے ذہن سے کیوں اتر جاتے ہیں اور اس کے ذہن میں ایک نرالا سوال ابھرا۔ کیا آدمی کا اپنا نام بھی ذہن سے اتر سکتا ہے؟ اسے جانے کیے بھوپلی بسری کہانی یاد آگئی ایک مکھی تھی وہ اپنا گھر لیپ پتھری لیپتے وہ اپنا نام بھول گئی لیپنا چھوڑ چھاڑ وہ سمجھتا تھی ہوئی بٹل کے سینگ پر جائیٹھی اور بولی بٹل بٹل میرا نام کیا ہے۔ بٹل نے بے کہے سے رونت سے اپنا سینگ ہلا یا اور اسے اڑا دیا۔ پھر وہ بھیں کے پاس گئی۔ بھیں نے اسے دم سے دھنکار دیا۔ پھر وہ گھوڑے کے پاس بھاگتی ہو گئی۔ گھوڑے نے بڑے وقار سے آہستہ سے جھر جھری لی اور اسے اپنی چمکتی دمکتی جلد سے اڑا دیا۔ پھر وہ گھر آئی ہوئی کوتھر کے پاس گئی اس نے بھی اسے بازو پھر پھر اکراڑا دیا آخروہ ایک بوڑھیا کی ناک پر جائیٹھی بوڑھیا نے جھلا کر ناک پر ہاتھ مارا اے ہے یہ کم بخت خوست ماری مکھی آنکھ نہیں لگنے دیتی اور اس جھرکی سے مکھی کو اپنا نام یاد آگیا۔ چونکہ میرا ایک نام ہے اس لئے میں ہوں اور اگر میرا نام نہ ہوتا۔ اور اس شخص کا کیا نام تھا جو قافلہ میں شامل ہوا اور قافلہ سے ٹوٹ گیا۔ تب آپ نے چراغ غل کر دیا اور یوں ارشاد کیا کہ خدا ہمیں جزاۓ خیر دے میں نے اپنی اطاعت کا بار تھماری گردن سے اٹھایا اور چراغ غل کر دیا کہ مہاوا از راه غیرت کی کے قدم ن اٹھیں اے عزیز و اس اندر ہیرے سے فائدہ اٹھاؤ اور ایک ایک اوٹ لے کر بھاں سے نکل جاؤ کہ بعد میرے کوئی تھمارا متاثری نہ ہو گا اور سب ساکت و جامد بیٹھے رہے ماں و ایک کے پس جب آپ نے چراغ دوبارہ جلا یا تو کائنات کی ترتیب بدل چکی تھی اور سپاہ میں سے ایک کم ہو گیا تھا۔ وہ ایک جس نے شہادت سے گریز کیا اور کائنات کو بدلنے سے ڈر گیا اور کائنات میں درہمی پیدا کر گیا۔ خالم و جاہل انسان کا کائنات کو ہر صورت برہم کرتا ہے تو وہ ایک جس نے کائنات کو درہم نہ کرنے کی نیت سے درہم کیا، کون تھا؟ کہاں سے آیا؟ کہاں گیا؟ کون تھا کہ اس کے گریز کو سب نے جاتا اس کا نام کوئی نہ جان سکا اور ان سوالوں کے ساتھ اس کے ذہن میں ایک تصور مرتب ہونے لگی کہ ایک شخص مشق کے بازار میں کھڑا اندر و مبایہات کرتا ہے کہ کیوں کروہ اس ریگزار بلاسے لکھا ت ایک مرد بزرگ نے اسے فرط غضب سے دیکھا تیری مان تیرے سوگ میں بیٹھے کیا تو وہ شخص ہے جس نے حق کو دیکھا اور حق کی شہادت سے رو گردالا ہوا اس جھرکی پر سراس کا جھک گیا اور متساف ہو کر بولا کاش میری مان نے مجھے نہ جانا ہوتا کہ میں حق کا ہمسفر ہوا اور حق سے رو گردالا ہو گیا۔ لوگوں میں سے جو نہ جانتا ہو وہ جان لے کر میں دن بھر اس قافلے کے ساتھ رہا جب دھوپ ڈھلی جب بھی میں اس قافلے کے ہمراہ تھا جب شام پڑی تب بھی میں اس قافلے کے ہمراہ تھا۔ جب رات نے خیسہ ڈالا تو میں اس سے جدا ہو گیا کہ رات دلوں میں خوف اور وسوسہ پیدا کرتی ہے اور قافلوں کو منتشر کرتی ہے۔ پھر وہ چھپ ہو گیا وہ جس نے کائنات کو بدلنے سے ڈر کر کائنات کو درہم کیا تھا تا دیر چپ رہا پھر یوں مخاطب ہوا ائے ہو تم پر اے اہل مشق کرم مجھ سے بھی گزرے۔ تم نے حق کو نیزے پر بلند دیکھا

اور تم نے حق کی شہادت نہ دی۔ اس پر سب سرجھک گئے اور جب انہوں نے اس پر غور کیا تو وہ روپڑے میں شہادت دیتا ہوں اس لئے میں ہوں۔ مگر حق بھی کیا میری شہادت کا محتاج ہے اس کے ذہن میں ایک اور سوال پیدا ہوا۔ سچائی اتھار کی کیوں طالب ہے اور شہادت کی کیوں محتاج ہے؟ اور سچائی خود کیا ہے؟ اپنے نام کا اعلان اس وقت اس لاری میں کیوں سچائی کا اظہار تھا اور اب کیوں نہیں ہے؟ کیا جس وقت جس کے اتھار میں جو کھوں ہو وہی سچائی ہوتی ہے؟ تو سچائی ایک اور مطلق نہیں ہے۔ سچائی کے سوچھے ہیں؟ سوال سے سوال پیدا ہونے کے سلسلے کو اس نے طول پکڑنے نہیں دیا اور اس خیال کے ساتھ منقطع کر دیا کہ یہ مابعد اطیاعیتی باتیں ہیں اور لاری اور مابعد الطیعت کا کیا رشتہ ہے؟ یہ حافظت کی کارستانی ہے کہ اس کی زندگی کا ایک غیر اہم سفر اسے خواہ مخواہ یاد آگیا ہے وہ لاری لاریوں کے ہجوم میں گم ہو گی وہ سفر اپنے مسافروں کی باتیں اور خیالوں کے ساتھ انسانی سفر کے سمندر میں لمحہ بھر کے لئے بلیکی طرح اٹھا اور سمندر میں کوئی تبدیلی کئے بغیر ہر لوگ میں رل لی گیا اس کی یاد میں بھی بس یونہی وہ ایک نقطہ بن کر بھر آیا ہے اور جب وہ لمحہ بھر بعد میں گا تو شاید پھر کچھ یاد نہ آئے۔ آخراں کی زندگی میں یہ سفر کوئی واقعہ نہیں ہے اس مزاحمت کے باوجود یاد کا وہ نقطہ اس کے تصور میں منڈلاتا رہا وہ جو گزر گیا تھا عودہ کر آیا تھا اور اس کے گرد گھیر ڈال لیا تھا۔ اس لمحے کے آگے پر ڈالتے ہوئے سوچا کہ آدمی اپنے اعمال کا کتنا ایسر ہے کہ جو نقطہ منہ سے نکل گیا وہ اس کی عمر قید ہے اور گزر رہا ہوا لمحہ تصور بر بن کر اس کے ذہن پر چھا کیا۔ اس سے اب بخطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب تو اپنے آپ کو ظاہر کرنا ہی پڑے گا۔ لٹکنگو ہر پھر کرفساوات پر آگئی تھی اور سفید بگلا ایسی دھوکی اور گھنٹوں تک کے کوٹ میں ملبوس شخص نہایت سنجیدگی سے یہ استدال کر رہا تھا کہ اس خونیں ڈرامہ کا مجرم کون ہے اسے اس استدال کی ایک ایک کڑی جھوٹ کی پوٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ اس نے بار بار سوچا کہ اگر وہ اس وقت اکیلانہ ہوتا تو اس استدال کی وجہیں اڑا دیتا۔ استدال جاری رہا اور اس کی جھنجھلاہٹ بڑھتی تھی۔ پھر قاس خوف دہشت کی فضائیں وہ لیکا یک بہادر بننے اور اپنے آپ کو ظاہر کرنے پر ٹل گیا۔ اس نے طے کیا کہ اب کے اگر بگلا ایسی دھوکی والا شخص اس سے مخاطب ہوا تو وہ چھوٹے ہی اسے اپنानام بتائے گا۔ اپنے نام کے اتھار کا اس نے یوں تصور کیا جیسے اسے کلمہ پڑھتا ہے یا اتنا لمحہ کا نزہہ لگاتا ہے جس میں اور صرف نام کا اعلان بھی کبھی کبھی اتنا لمحہ کا نزہہ، بن جاتا ہے خدا کی قسم اس زندگی کی حقیقت میرے لئے بکری کی چیزیں سے زیادہ نہیں ہے اگر میرے ہتھیار ٹوٹ بھی جائیں تو میں ان پر پتھر پھینکنا شروع کر دوں گا تا آنکہ موت میرا خاتمة کر دے گیزہ کی سوال زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے ذرت نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے یہ پوچھ ٹلی سے جانے کب کے سے ہوئے اتوال اس کے ذہن میں گوئختے گلے۔ مختلف زبانوں میں مختلف زبانوں سے لکھے ہوئے فقرے اس کی اپنی زبان بن گئے تھے۔

مسٹر آپ کا نیا پرنسپل تو، بہت بودا لکھا چھیرے بدن والے شخص نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
موئے شخص نے اسے سوال پڑھا کیا ہوا؟

اپنے ذو دہن کا لج کا ذکر تھا وہاں پولیس تھیں ہو گئی ہے۔ ہاں آس موئے شخص نے اس طرح کہا کہ مجھے اب یہ بات نہیں پڑھتے ہو؟
ہو گئی ہے ہاں اس کی طرف اس نے غور سے دیکھا لالہ تم کا لج میں پڑھتے ہو؟

اس کا جی چاہا کہ وہ چلا کر کہے جی میں کا لج میں پڑھتا ہوں اور میر انعام علی احمد ہے ایک چنگاری کی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی اور سینے میں ایک غبار مل کھانے لگا مگر یہ غبار سینے میں مل کھاتا ہوا حلقوں میں آیا اور پیٹ میں رکار کارہ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا کہ جی پھر وہ سوچنے لگا کہ اب یہ شخص خود ہی دوسرا سوال کرے گا اور نام پوچھنے گا اور میں صاف کہہ دوں گا اس نے آزمائش کے اس لمحے کے لیے اپنے آپ کو اندر سے تیار کرنا شروع کر دیا اور بار بار دل میں ایک مکالمہ دھرایا جی میر انعام علی احمد ہے مگر چھیرے بدن والے شخص نے کا لج کا قصہ شروع کر دیا تھا اور بات اور طرف انکل گئی اس پر اسے سخت تاؤ آیا۔ اس نے سوچا کہ یہ اسے وہ کچھ کہنے سے جو وہ کہتا چاہتا ہے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے اس کا جی چاہا کہ وہ اس گفتگو کو پیچے میں روک دے اور اعلان کرے کہ جناب مجھے علی احمد کہتے ہیں مگر چھیرے بدن والے شخص اس روشنی سے بول رہا تھا کہ اسے نوکتے کی ہمت نہ پڑی۔

ماہر ان میں ایک او شیئر کاریہ سے وال گیا تھا۔ گیٹ میں قدم رکھا تو پولیس کھڑی تھی۔ اندر گیا تو پولیس برآمدوں میں پولیس پرنسپل کے کمرے کے آگے پولیس ماہر ان میں ائمہ ہیں وہاں چلا آیا۔ وہ چپ ہوا پھر کہنے لگا ماہر ان میں رہا جو اسے جب ہوئی پر ہندو مسلم دنگا ہوا تھا۔

موئے شخص نے ٹھٹھا سانس بھرتے ہوئے درد بھرے لبھے میں کہا یاد ہے یاں کشڑاں سے مسلمان لگا ہاتھا بہت سنتیا ناہی تھا۔
تو ماہر ان جی لاں کرتی کے میاں لوگوں نے کا لج کے مسلمان دیار تھیوں کو بھڑکا دیا کہ کا لج پر کا گنگریں ہی کا جھنڈا کیوں ہے مسلم
لیگ کا جھنڈا۔ بھی لگنا چاہیے اس پر ادھک دلگا ہوا پوری لاں کرتی چڑھ آئی اور لگی روں مچانے پر تو اس سے پرنسپل انگریز تھاریوں اور لے
کے گیٹ پر کھڑا ہو گیا اور کسی کو اندر گھسنے نہیں دیا پر تو نئے پرنسپل نے تولید کر دی۔

اس کا خون پھر کھولنے لگا اس کی یہ طبیعت چاہ رہی تھی کہ وہ جواب میں ہندو طلباء کی حرکتیں بیان کرنے لگے۔ مگر چھیرے بدن
والے شخص خود ہی اس سے مخاطب ہو گیا۔ مسٹر آپ کے کا لج میں مجھن دیار تھی کتنے ہوں گے؟

اسے دھٹا پینہ آگیا اور لاری گھومتی ہوئی معلوم ہونے لگی اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہاں کیک سارے لاری کے مسافراتے گھورنے

لگے ہیں اس نے سامنے جڑے ہوئے آئینہ پر نظر ڈالی جہاں پچھلی نشتوں کے سارے مسافروں کی صورتیں نظر آ رہی تھیں مکری کے برابر والی نشست خالی چڑی تھی وہ چونکہ پڑا وہ سکھ کہاں گیا؟ اتر گیا۔ مگر کیوں؟ اس کا دل پیشہ ہی تو گیا بھٹکل اس کی آواز لکل کچھ اندازہ نہیں اور تھوکنے کے بہانے مکری سے باہر سڑکاں لیا اور پھر اسے وہی احساس گزرا کہ لاری بے مقصد بے منزل بے تحاش دوڑی چلی جا رہی ہے اور اب کسی کھٹہ میں اتری۔

آپ کی کاس میں کیا سکھیا ہو گی؟

اس کے دھر کتے ہوئے دل کو اندر سے کسی نے پکڑ لیا نشست پر وہ جما کا جمارہ گیا اور پسینے کی ایک الگ گردان سے چل کر پشت پر سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ لاری کھٹہ میں اتر گئی ہے اور آہستہ آہستہ خلامیں تیرتی ہوئی نیچے جا رہی ہے۔ اسے خود یاد نہیں کہ اس نے کیا جواب دیا تھا اور مسافروں پر اس کا کیا رد عمل ہوا تھا اسے یہ بھی یاد نہیں کہ باقی رستہ کیسے کتنا اور لاری سے وہ کہ اتر اباں جب وہ تانگہ میں بیٹھ کر گھر کی طرف جا رہا تھا تو اس کا دل کسی قدر آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ پھر اس نے رو مال سے چہرے کی گرد صاف کی اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا آخر نام میں کیا رکھا ہے اور یوں بھی اسلام میں خود کشی حرام ہے۔

میاں الحمد صاحب آ جاؤ بھائی شریف برآمدے میں مکڑا آواز دے رہا تھا وہ بس شینڈ کے سامنے نکل کر باہر آیا اور مکری آفس میں چلا گیا۔

دیر بعد جب وہ باہر لکھا تو خیال کی وہ روٹ پچھلی تھی مگر یاد کا وہ نقطہ ایک تاسف کی کیفیت کے ساتھ ہے، ان میں اب بھی منڈ لارہا تھا ویسے اسے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ وہ عینکن لمحہ گزر گیا اور اب وہ اس کے نتاں کی واثرات کے جال سے آزاد ہے، کون جانتا ہے کہ اس نے ایک لاری میں سفر کرتے ہوئے کیا کہا اور کیا نہیں کہا؟ اور کہنے نہ کہنے سے فرق بھی کیا چلتا ہے جو شخص جو دے ویسی رہے گا اور سچائی کسی اعلان کی محتاج نہیں ہے پھر اس نے قدر رے رخ بد کر استدال کیا کہ سچائی کے سوچرے ہیں تو اس کی قاب کشائی کے بھی سو طریقے ہیں۔ لازم نہیں آ دی سر بھی کتنا یہ سچائی کے لئے جان دیا بڑی بات نہیں۔ سچائی کو جاننا بڑی بات ہے۔ ویسے سچائی کوئی شے ہے بھی نہیں؟ اور اس سوال کے ساتھ اسے اپنا تاسف اور اپنی عذر تراشی دو گوں ہی بے معنی نظر آئے۔

یوں سوچنے سمجھنے کے باوجود وہ اندر سے اکھڑا اکھڑا رہا۔ ایک نامعلوم غم نے اس کی ذات کو گھیر لی تھا اور وہ اتنا کھو یا کھو یا کھڑا تھا کہ جب تک شریف نے اس کے کامدھے پر ہاتھ نہیں رکھ دیا اس کے آنے کا سے پہنچیں چلا حد ہو گئی میں تمہیں آواز پر آواز

دے رہا ہوں اور تم سنتے ہی نہیں ہو یا رہبرے ہو گئے ہو کیا؟ آؤ چلو تاگلہ کر لیا ہے۔

بھی یاں شریف کا اتنا شور ہے کہ کچھ سنائی نہیں دیتا، اس نے مخدرات کی اور پھر وہ دونوں چل کرتا گئے میں سوار ہو گے۔

تاگلے میں بیٹھ کر اسے شریف کی بات کا خیال آیا تو وہ اسے پکار رہا تھا اور اس نے سنائیں اور جب اس نے اس بات پر غور کیا تو

وہ شک میں پڑ گیا کہ وہ اپنا نام تو نہیں بھول گیا۔



سوٹ کے تار

اس نے اقرار کیا کہ وہ زندہ نہیں ہے اور اس اپنے کوونٹ میں جانا چاہیے مگر اس وقت وہ یوں چل رہا تھا جیسے اس کی سب سویاں نکل چکی ہیں اور وہ زندہ ہو گیا ہے۔ اتنی سویاں تھیں میرے اندر اس نے اپنے اور گرد حیرت سے دیکھا پھر وہ انھیں کھڑا ہوا اور چلنے کا تو میں زندہ ہو گیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا پھر مزید اطمینان کے لئے کہ وہ حق زندہ ہے۔ وہ پہلے کوونٹ گیا پھر پہلے کوونٹ سے دوسرے کوونٹ میں گیا، اس نے گیارہ کے گیارہ کوونٹ میلے کر دالے پھر اس نے بارہویں کوونٹ میں قدم رکھا۔ میں کس طرف جا رہا ہوں اور یہ لوگ کس طرف جا رہے ہیں اس نے امتنانی ہوئی خلقت کو حیرت سے دیکھا سواری اور سواری کے چیخپے سواری پہلی منی کا لیپ، ہمیڈ لائٹوں پر سیاہی ملی ہوئی اور سامان الدار ہوا اندر سواریاں ٹھنڈی ہوئی وہ بھائی دوڑتی بھی کاروں اور فرسودہ ٹکیبیوں کو حیران دیکھتا رہا۔ یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں اور کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا۔ جو موٹ کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور وہ ہزاروں ہی تھے۔ مگر میں کن لوگوں میں سے ہوں سڑک خالی تھی اور سارے ہوں بول رہا تھا۔ سڑک کے دونوں سمت موزوں، ٹکیبیوں، رکشاوں، سکوڑوں، سائیکلوں اور رنگوں کی بقیہ ہوئی قطار میں سواریوں سے نکل نکل کر بھاگتے ہوئے چھپتے چھپاتے لوگ سڑک سے اتر کر کچھ رستے پر درخت اور جھاڑیاں اور وہ نالہ جواب خشک پڑا تھا۔ وہ آہت سے اس خدق میں اتر گیا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے سروں کو نیوڑھائے ہوئے لوگ دم تکوڑتے ایک لڑکی کی سفید سائن وائل شلوار اور اون کی چست نیچس دلوں میں سے خراب ہو گئی تھیں اور درخت کے سامنے میں کھڑی ہوئی شیور لیٹ جس پر پہلی منی لپی ہوئی تھی۔

وہ گڑھ سے یوں باہر آیا جیسے سات سو برس تک سونے کے بعد غار سے برآمد ہو رہے کیا سکدی تھی بدلا گیا۔ دنیا سے بدی ہوئی نظر آئی کاروں، ٹکیبیوں اور سکوڑوں کی کھڑی ہوئی قطار اب وہاں نہیں تھی ٹرینک معمول کی رفتار پر رواں دواں تھا۔ سامان سے لدی پھندی مضطربانہ دوڑتی ہوئی ایک ٹکیسی چلتے چلتے اس پتوڑی کی دکان پر آ کر کی جہاں رینے یوں بول رہا تھا۔ ایک سوت بیٹھ والا آدمی اتر کیا تھا؟ پریشان اور مضطرب تیزی سے قدم اٹھتا ہوا دکان پر گیا۔ پھر مطمئن و اپس آ کر ٹکیسی میں بیٹھا۔ ٹکیسی والے نے

بیک کر کے ٹیکی کوموڑا اور جس طرف سے آ رہا تھا اسی طرف چلا گیا۔

لوگ آس پاس سے بھاگ بھاگ کر دکان پر آ رہے تھے اور ریڈ یو کے گرد اکٹھا ہو رہے تھے شاید خبریں ہو رہی تھیں اس نے جلدی جلدی قدم اٹھائے اور دکان پر پہنچ گیا۔ ملاں پنواڑی نے سونچ مردوڑا اور ریڈ یو کا گلاغونٹ دیا۔ ایک سکوٹر تیزی سے دوڑتا ہوا دکان کے قریب آ کر اچانک رکمالاں کیا خبر ہے؟ اس نے سکوٹر پر بیٹھے بیٹھے بچھا۔

ملاں نے سکوٹروالے کو دیکھا جواب دینے کی بجائے بکس کھول کر کوکا کولا کی ایک بوگل نکالی اور پاس کھرے ہوئے تو مند آدمی کے ہاتھ میں پکڑا دی اور پہلوان۔

پہلوان نے بوگل مند سے لگاتے لگاتے سکوٹروالے کو دیکھا اور کہا یا یو سیز فائز ہو گیا۔

سیز فائز؟ سکوٹروالے نے حیران ہو کر تھیں نہ کرنے کے انداز میں دکان پر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا، دیکھتا رہا پھر اس نے خاموشی سے سکوٹر سارث کیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

سامنے سڑک پر ناگہ تیز گزر رہا تھا۔ ”جگ کھیڈ نہیں ہندی زنا نیاں دی۔“ اوئے چپ کر۔ پہلوان نے بے مزہ ہو کر بوگل سے منہ ہٹاتے ہوئے آواز دی۔ ناگلے کی رفتار آہستہ ہوئی پھر وہ دکان کے سامنے آ کر رک گیا۔ پہلوان جی بہت روکھے ہو رہے ہو۔

پہلوان نے کوئی جواب نہیں دیا مگر کوکا کولا کی بوگل ابھی آدمی سے زیادہ بھری ہوئی تھی الگ رکھ پیسے کرتے کی جب سے نکال ملاں کے سامنے رکھے اور وہاں سے سیدھا ناگلے کی طرف گیا چیچے کی نشست پر جو پھیلا کر بیٹھا ہوا چل یا۔

پہلوان جی لڑائی کی کیا خبر ہے؟
اوئے بکواس بند کر۔

سیز فائز تو گویا سیز فائز ہو گیا۔ اسے رفتہ رفتہ تھیں آ رہا تھا اور ریڈ یو نے اعلان نشر کر کے پھر قومی نفعی شروع کر دیے تھے۔ دکانوں میں رکھے ہوئے ریڈ یو سٹوں کے گرد اکٹھا ہو جانے والا جمع بکھر رہا تھا جیسے کوئی شوٹوٹا ہو یا کوئی بڑا جلسہ ختم ہوا ہو اور تم اس عورت کی مانند موت ہو جانا ہو اپنے کاتے ہوئے سوت کو مختبوط ہو جانے کے بعد تاریکو یا کر تھی۔ ریڈ یو سٹ سے نوٹی ہوئی وہ نوی اس کے برابر سے گزری۔ ٹھیک ہے مگر نوی کا ایک فرد چلتے چلتے بو لا مگر کشیر میں کیا ہوا؟ کشیر میں کیا ہوا؟ اس کا جی چاہا کوہ تیزی سے چلتے اور نوی میں شامل ہو جائے مگر نوی تیزی میں تھی اور وہ اب یوں چل رہا تھا جیسے زندہ نہیں ہے کشیر میں کیا ہوا؟ اس نے حیران ہو کر سوچا اور جیسے اس کے اندر کوئی سوئی ہو کر کھلکھل رہی ہو۔ کیا میری سب سویاں نہیں نکلی تھیں۔ جب میں قصر سون میں تھا تو ایسا ہوا

کہ حتیٰ جو میرے اسیروں میں سے باقی رے اور بچ لٹکے تھے۔ اور یہ وہ کام کا حال پوچھا انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ لوگ جو بچ گئے ہیں وہاں کے صوبے میں ذلت اٹھاتے ہیں اور یہ وہ کام کی دیوار ڈھانی ہوئی ہے اور اس کے پھانک آگ سے جلے ہیں اور بادشاہ نے مجھ سے کہا کہ تم تیراچہ کیوں اداس ہے چنانچہ تو یہاں نہیں ہے۔ مقرر تیرے دل کو کوئی روگ لگا ہے۔ جب میں بہت ڈرائیں نے بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ ہمیشہ چلتا رہے میں کیوں اداس نہ ہوں جبکہ وہ شہر جہاں میرے باپ داؤں کی قبرگاہ ہے اجاڑ پڑا ہے اور اس کے اچانک آگ سے بھسم کئے گئے ہیں یا رہو تو جوان چائے پینے لگا تھا مگر پیالی مند کے قریب لے جا کر اس نے پھر میز پر رکھ دی۔ ان میں ایک آدمی تھا جس کی سرے سے آنکھیں ہی نہیں تھیں۔

آنکھیں ہی نہیں تھیں؟ کیا مطلب؟

یارخانی سوتے تھے آنکھ کے ڈلنے نہیں تھے۔

اچھا؟ حد ہو گئی تم نے خود دیکھا تھا؟

میں نے؟ ہاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا میں خود کی پگیا وہ بوڑھا آدمی تھا۔ بوڑھے تو خیر وہ سب ہی تھے اور افسوس کے ملے جلے لجھ میں کہنے لگا کمال ہے یا رانے والوں میں کوئی جوان نہیں تھا نہ مرد نہ عورت۔
مگر کیوں؟

کیوں کیا جوان مرد کو تو وہ دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔

اور جوان عورت کو؟

جو ان عورت کو نوجوان چپ ہوا پھر آہستہ سے بولا اسے ٹھین بارتے۔

وہ لوگ جو تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیا کرتے تھے اور اگر تم چھے ہو تو مرنے کی آرزو کرو۔ اس کے اندر پھر کچھ چھپر ہاتھا۔ جیسے کوئی سوئی ہے کہ کھنک رہی ہے تو کیا کوئی سوئی میرے اندر اتر گئی تھی مگر میری تو سب سوئیاں نکل گئی تھیں؟ تم نے کچھ نہیں بتایا؟

میں نے کہا؟ وہ ایسے چونک کر بولا جیسے سوتے سے انھوں نے ہمیاں اور ہمیاں کی اذیت بھری روکھر گئی۔

ہاں تم تو اس علاقوں میں تھے جو زمین آگ کی تھام وہاں سے لٹکے کیے؟

میں کیسے لکلا؟ وہ بھیکی ہی نہیں ہے۔ چپ ہوا پھر چائے کی بیالی انھا کر پینے لگا مگر پھر فوراً ہی بیالی رکھ دی خشکی ہو گئی۔

تو جوان نے اپنی بیانی چھو کر دیکھی ہاں شفٹدی ہو گئی اور مٹا کیں؟

شکیں یا راس نے جاتی لی میں اب چلتا ہوں!

کیوں؟ تو جوان نے اسے تجوہ سے دیکھا۔

مجھے دیر ہو رہی ہے وہ انھوں کھرا ہوا۔

اب وہ ایسے چل رہا تھا جیسے زندہ نہیں ہے میں کیسے نکلا؟ مگر کیا میں نکل آیا ہوں اس نے سوچا اور وہ جیران ہوا مگر جو نہیں نکل سکے؟ وہ نہ کہا اس کے اندر کسی نامعلوم گوشے میں کچھ چھوڑ رہا تھا کیا سوئی میرے اندر بیندھ گئی ہے؟ اور وہ جو نہیں نکل سکے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ لوگ جو باقی فوج ہے۔ وہاں کے صوبے میں ذات اٹھاتے ہیں اور یہ وٹکم کی دیوار ڈھانی گئی اور اس کے پھانک جلاۓ گئے اور وہ لوگ جو تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیا کرتے تھے اور اگر تم سچے ہو تو مرنے کی آرزو کرو مر نے کی آرزو؟ مگر کیا میں زندہ ہوں؟ وہ دیر تک اس جیسی بیض میں رہا کہ وہ زندہ ہے یا زندہ نہیں ہے پھر اس نے طے کیا کہ وہ زندہ نہیں ہے کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا اس اندر جی کوٹھڑی میں وہ سوچوں سے بیندھا پڑا تھا۔ بے حس و بے حرکت بیندھی ہوئی سوئیاں کو ان نکالے تھے بھائیں بھائیں کر رہا تھا میرا خاوند کہاں ہے؟ کیا میرا خاوند کہاں ہے؟ تھیں کی دکھ بھری روکو حقیقت کی زیادہ دکھ بھری رو نے کاتا۔ وہ عورت سے پوچھی اس کا خاوند کہاں ہو گا؟ اس نے جیران ہوا کر سوچا وہ لوگ جو کبھر کے تنوں کی ماں میدا توں میں سوتے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا مر جاؤ۔ پھر ہم نے انہیں زندہ کر دیا۔ اور تم اس عورت کی طرح مت ہو جانا جو اپنے کاتے ہوئے کو مضبوط ہو جانے کے بعد تار تار کر دیا کرتی تھی۔ توڑا جو تو نے آئیں تباش دار تھا۔ لوگ سڑک کے اس کنارے تک تتر تر تھے جیسے کاتا ہوا تار تار ہو گیا ہو ہوا میں اڑتے ہوئے نوٹے ہوئے دھاگے۔ راہ میں بکھرے ہوئے آئینے کے ریزے وہ ریزوں سے بہت فیکھ لگا۔ مگر اس کے اندر کوئی جیز چھوڑی تھی سوئی میرے اندر ہے میں زندہ نہیں ہوں۔

چوراہا غور کرتے کرتے وہ نہ کہا لوگ کہاں گئے ہو حق کرتی سڑک جہاں تھاں پڑی ایٹھیں نیز گی میز گی اندر گی وحدنی لاں بزر ہیں۔ ایک ڈبل ڈیکر جہاں تھاں پڑی ایٹھوں سے پیچتی بچاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے شیئے پکھنا چور تھے اور پر کی منزل خالی تھی نیچے کی منزل میں ڈرائیور تھا اور کائنٹ کلم تھا اور ایک بوڑھی سواری تار تار ہو جانے والے سوت کا ایک ٹوٹا دھاگہ اور میں تار تار سوت کا ایک تار مگر میں کیسے نکلا؟ تو کیا میں نکل آیا اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکلا تھا تم بھی ان کو وہاں سے نکال دو۔ وہ بولے کہ جب ہم اپنے گھروں سے لکا لے گئے اور اپنے بچوں سے الگ کئے گئے تو اب ہمیں کیا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لایں گے پھر جب لڑانا ان پر دوچ کیا

گیا تو ان میں سے سو اے چند کے سب ہی پھر گئے۔ آنسو تو کیا میں رورہا ہوں؟ اس نے اپنی دلکشی ہوئی بھیگی آنکھوں کو رومال سے پوچھا مگر اس کی آنکھیں بدستور دکھرتی تھیں۔ خالی سڑک جہاں تباہ پڑی انشیں، شکست و خیدہ تاپینا سبز سرخ تھی اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لایا تھا کہ آپ میں خونریزی نہ کرنا اور اپنوں کو اپنے ملک سے مت نکالنا تم نے یہ اقرار کیا تھا اور تم اس کے گواہ ہو میں گواہ ہوں؟ تاریخ اس تو کیا تھا کہ آپ میں خونریزی نہ کرنا اور اپنوں کو اپنے ملک سے مت نکالنا تم نے یہ اقرار کیا تھا اور تم اس کے گواہ ہو میں گی؟ ذلیل بہہ جائیں گے اور سوتے رہ جائیں گے؟ اس نے تصور کیا چیزیں اس کی آنکھ کے ذلیل نہیں ہیں پوچھنے ہیں اور خالی سوتے ہیں کیا میں نکل آیا ہوں؟ تیز گزرتی موڑ دھنا اس کی آنکھوں میں جیسے بہت سی سو نیاں پیوست ہو یہیں تیز گزرتی ہوئی موڑ کے چار بلب تھے اور چاروں اپنی تیز گرم روشنی سے چاچوند پیدا کر رہے تھے اور اس پر اب ہیلی منی کا لیپ نہیں تھا تو اب رات ہے؟ وقت کا تو دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ دن گزر چکا تھا اب شام گزر ریتی تھی اور رات کا ڈیرہ تھا۔ سڑک خالی تھی اور درخت خاموش تھے پرندے جن کے آشیانے سلامت تھے وہ وقت یاد کرو جب تم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے الگ کئے گئے مگر میں کیسے نکلا اور وہ لوگ جو نہیں نکل سکے؟ اور جوان عورت کو؟ جوان عورت کو؟ اسے وہ نہیں مارتے اگر تم بچے ہو تو مرنے کی آرزو کرو۔ مرنے کی آرزو؟ تو کیا میں زندہ ہوں؟ اس نے جبرت سے سوچا پھر اس نے اقرار کیا اور اس نے گواہی دی کہ وہ زندہ نہیں ہے مگر میں مرکر زندہ ہوا تھا یا زندہ ہو کر مر رہوں؟ اس کے دماغ میں ایسے سوال پیدا ہو رہے تھے جیسے گلی گندی زمین میں کنسلا نیاں پیدا ہوئی ہیں۔ دماغ میں ریختی ہوئی کنسلا نیاں اور سوالات مگر اس کی آنکھوں میں پھر سو نیاں ہی چھینے گئی تھیں اور آنسو تھوڑی تھوڑی جلن کے ساتھ بہرہ رہے تھے۔ اس نے پھر جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں کو پوچھا سامنے سے ایک ٹوٹی آرہی تھی۔ آنکھوں کو پوچھتے ہوئے جیسے آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے تو سب ہی آنکھوں میں سو نیاں ہیں شہزادی صبح سے شام تک اس کی سو نیاں چلتی رہتی پھر ایسا ہوا کہ سب سو نیاں نکل آئیں بس آنکھوں کی سو نیاں رہ گئیں اور شہزادی نے دل میں کہا کہ جب آنکھوں کی سو نیاں نکل آئیں گی۔ تو یہ جوان زندہ ہو جائے گا اور اس اندر حیری کو خiltrی سے نکل آئے اور پھر اس کے بعد کے تصور سے وہ بہت پریشان ہوئی مگر وہ بہت تحکم گئی اور اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے دل میں کہا بس ذرا پانی پی آؤ۔ اس نے نہاتھ روکا۔ باہر گئی پانی بیا اور ادائے پھر وہ واپس آئی مگر اس نے دیکھا کہ کو خiltrی کا دروازہ پھر بند ہو گیا ہے۔ بہت زور سے ہارن دیتی ہوئی ایک کار اسکے برابر سے گز ری چلی گئی۔ سڑک پر چلتے چلتے وہ فٹ پا تھا پر آ گیا۔ فٹ پا تھا پر اس کے دامیں ہائی سے کئی آدمی گزارے اور آگے نکل گئے۔ جیسے ان سب کی آنکھوں میں کچھ تکلیف ہو اور ایک کنسلا اپنی پھر ریتی گئی۔ کیا سب آنکھیں پانی بن کر بہہ جائیں گی اور اس نے تصور کیا چیزیں سب کی

آنکھیں بہے گئی ہیں۔ سب آنکھیں خالی سوتے ہیں اور پچھے ہیں بریک کے تیز شور کے ساتھ ایک کارچہ چورا ہے میں آ کر کر گئی۔ چورا ہے کو عبور کرتا ہوا تیز رفتار سکوٹر سڑک پر پڑی ہوئی اینٹوں کے ساتھ درمیان لٹکھڑا یا اور گرپڑا۔ وہ تنک گیا سڑک پر ٹریک نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر وقت یقینی کہ جو سواری گزر رہی تھی تیز گزر رہی تھی اور چورا ہے پر نصب بیز سرخ ہتھ بینائی سے محروم تھی اس نے فکر نہ خیلی تھی کہ دیکھا اور دل میں کہا کر یہ تھی بصارت کھو چکی ہے اور سست دکھانے سے محفوظ ہے پھر اس نے دمکیں باسکیں دیکھ کر احتیاط سے چورا ہا عبور کیا اور جلدی جلدی چلنے لگا مجھے واپس چلتا چاہیے۔

وہ کھونٹ کھونٹ ہوتا واپس ہوا اور وہ حیران ہوا یہاں جو مکان تھے وہ کہاں گئے ٹھنڈوں ٹھنڈوں مٹی میں چلتا تباہ و بر باد غمار توں کے درمیان سے گزرتا وہ اندر ہیمرے میں واپس پہنچا۔ رات کا ڈیرہ تھا اور قاحد بجا کیں بجا کیں کر رہا تھا اس نے اندر قائم رکھتے ہوئے کہا کہ میں نہیں نکلا تھا پھر وہ دراز ہوا اور اپنی جاتی آنکھوں اور دکھتے جسم کے ساتھ سوچا اور کہا کہ سب سوئیاں میرے اندر ہیں میں زندہ نہیں ہوں میں نے اقرار کیا اور میں نے گواہی دی۔

پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ مر گیا۔

